اردو نثر میں مزاح نگاری
کا سیاسی اور سماجی پس منظر
ڈاکٹر رؤف پاریکھ
انجمن ترقی اردو پاکستان

اردو نثر میں مزاح نگاری

کا سیاسی اور سماجی پس منظر

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،

کراچی۔۷۵۳۰۰

اردو

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اردو، پاکستان: ۶۳۰

ISBN-978-969-403-163-7

اردو نثری ادب

اشاعتِ اوّل: ۱۹۹۶ء

اشاعتِ دوم: ۲۰۱۲ء

قیمت: =/۷۰۰روپے

مطبع: غزالی برادرز، ناظم آباد، کراچی

دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمنِ ترقیٔ اردو، پاکستان کو بھی اشاعتِ کتب کے لیے
اکادمی ادبیات، پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے۔)

(ج) علی گڑھ تحریک کا ردعمل اور اس کا پس منظر

سید احمد خاں کو ۱۸۵۷ء کی تباہیوں اور انگریزوں کے مظالم سے مسلمانوں کو بچانے کی صورت نئے حالات اور خیالات، نئے تمدن اور نئی سیاسی قوتوں کو خوش آمدید کہنے میں نظر آئی۔ اس طرح احساس اور اقدار اور روایات کے قدیم سانچوں کی جگہ نئے سانچے بنے۔ ترکِ دنیا، بے عملی اور قناعت کی جگہ کوشش، عمل اور ترقی پر زور دیا جانے لگا۔(۵۸) علی گڑھ تحریک ایک فعال اور باقاعدہ تحریک کی حیثیت سے سامنے آئی اور اس نے سیاسی، تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی میدانوں میں نئے خیالات اور نظریات پیش کیے لیکن اس تحریک میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اس کی بنیادی خامی یہ تھی کہ اس میں زندگی کے مادّی پہلو اور عقلیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔(۵۹) اور دیگر پہلوؤں مثلاً تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی پہلو کو بھی مادّیت اور دنیاوی فوائد سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں سید احمد خاں نے جو عقائد اور نظریات پیش کیے اور جو نیا علم الکلام انھوں نے رائج کرنے کی کوشش کی اور اس میں بھی مادّیت، مغربیت اور ظاہری سائنسی حقائق کو رہنما بنایا۔ گو وہ اس کوشش میں مخلص ہوں گے لیکن ہر دم بدلتے سائنسی افکار کی اس دنیا میں ان کی اسلام اور سائنس کی تطبیق کی کوشش نہ صرف غیر ضروری تھی بلکہ سائنس پر حد سے زیادہ اعتقاد کا مظہر تھی۔ ایسی کوششوں کو اسلام کو محدود کرنے کی کوشش ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ اس طریقے میں خطرہ یہ رہتا ہے کہ سائنسی نظریات میں تبدیلی کے بعد مذہب میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی تا کہ دونوں میں مطابقت قائم رہے اور سائنسی نظریات ہر چند سال بعد تبدیل ہو جاتے ہیں۔

سید احمد خاں کی اسلام، عیسائیت، سائنس، نیچر اور فلسفے کی تطبیق کی ان کوششوں سے نہ صرف عام مسلمان بھڑک اٹھے بلکہ خود ان کے رفقا میں سے بھی بعض نے ان کے مذہبی عقائد سے شدید اختلاف کیا۔

سید احمد خاں اگر اپنی تحریک کو تعلیم تک ہی محدود رکھتے تو شاید ان کی اتنی مخالفت نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے انھوں نے ایک مصلح اور مجتہد کا کردار بھی ادا کرنا چاہا۔(۶۰) جس نے قدامت پرست لوگوں کے ساتھ ساتھ علما کو بھی برافروختہ کر دیا۔ سید احمد خاں کی مخالفت کی وجوہات میں

سب سے بڑی وجہ ان کے مذہبی عقائد ہی تھے۔ پھر ان کی مغرب کی نقالی اور مادیت سے بھی لوگ چڑتے تھے۔ مخالفت کی ایک اور وجہ ان کی انگریز دوستی اور انگریزوں کی حمایت تھی۔ سیاسی لحاظ سے جو لوگ برعظیم پاک و ہند میں انگریزوں کے خلاف جذبات رکھتے تھے اور انگریزوں کے برعظیم سے چلے جانے کے حق میں تھے انھوں نے بھی سید احمد خاں کو نشانہ تنقید و تضحیک بنایا۔ سید احمد خان نے اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں کئی مضامین شائع کیے جن میں لباس اور طعام کے قدیم طریقوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ ان کے جواب میں عام اخبارات میں مضامین لکھے جاتے تھے اور دونوں طرف سے پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں۔(۶۱)

علی گڑھ تحریک کے خلاف ردعمل تحریک کے اندر سے بھی ہوا اور باہر سے بھی۔ سید احمد خاں کے مذہبی عقائد سے تو ان کے کئی بلکہ تقریباً تمام رفقا اختلاف رکھتے تھے۔ تحریک کے بعض دیگر پہلوؤں بالخصوص مغربیت کی پیروی کے خلاف بھی تحریک کے اندر جذبات پائے جاتے تھے۔ باہر کے مخالفین میں کئی حلقے بالخصوص مذہبی ادارے، علما اور قدامت پرست پیش پیش تھے۔ البتہ ہر ایک کی مخالفت کا انداز اور وجوہات مختلف تھیں۔ کہیں تو یہ محض طریقِ کار کا اختلاف تھا اور کہیں وسیع نظریاتی خلیج حائل تھی۔ کہیں مخالفت سنجیدہ اور علمی بنیادوں پر ہوئی، کہیں محض جذباتی انداز سے اور کہیں طنزیہ اور ظریفانہ پیرائے میں۔ سید احمد خاں کے مخالف مذہبی اداروں میں دیوبند، ندوہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ شامل ہیں۔(۶۲) کچھ لوگوں نے ذاتی اور انفرادی سطح پر بھی سید احمد خاں کی مخالفت کی مثلاً مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج (۶۳) جب کہ مخالف اخبارات و جرائد میں ''نور الآفاق''، ''نور الانوار''، ''لوحِ محفوظ''، ''تیرھویں صدی''، ''امداد الآفاق''، ''شہابِ ثاقب'' اور ''تائیدِ اسلام'' وغیرہ شامل ہیں۔(۶۴)

سید احمد خاں کی مخالفت ایک ایسے حلقے کی جانب سے بھی ہوئی جسے بظاہر مذہب سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ اس حلقے کا مرکز لکھنؤ کا اخبار ''اودھ پنچ'' تھا۔ ''اودھ پنچ'' نے سید احمد خاں کی مخالفت میں مزاح سے کام لیا۔ دراصل اس دور میں ''تہذیب الاخلاق'' کے توڑ میں کئی اخبار اور رسالے نکالے گئے تھے۔ ''اودھ پنچ'' بھی انھی مخالفتوں کا شاخسانہ تھا۔

دراصل جب ایک قدیم ثقافت نئی قوتوں اور نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے

کی کوشش کرتی ہے تو ایسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں جو بعض اوقات الم ناک ہوتے ہیں اور بعض اوقات مضحکہ خیز۔ مسلمانوں نے بھی جب مغربی رسوم و رواج کو اپنانے کی کوشش کی تو ایسی غلطیاں اور حماقتیں سامنے آئیں۔(۶۵) لیکن سید احمد خاں اور ان کے ہم خیال افراد نے اس نئی تہذیب کو اپنانے میں بڑی عجلت اور غیر معقول مرعوبیت کا مظاہرہ کیا۔ سید احمد خاں کی تحریک اور ان کے نظریات قدیم اور مشرقی اقدار کے دل دادہ اور مذہبی ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے اشتعال انگیز، ناپسندیدہ بلکہ مضحکہ خیز تھے۔

چنانچہ علی گڑھ تحریک کے خلاف ایک ردعمل پیدا ہوا اور تحریک کو نشانہ تضحیک و تنقیص بنایا گیا۔ گو بعض حلقوں کا ردعمل جذباتی تھا لیکن کچھ لوگ مسائل کی نوعیت سے بھی واقف تھے اور نئے رجحانات اور نئی تہذیب کے اچھے اور برے پہلوؤں میں امتیاز کرتے تھے۔ مثلاً مولوی نذیر احمد، جو سید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں اور علی گڑھ تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے، اس معاملے میں بڑی متوازن سوچ کے حامل تھے۔ انھوں نے جہاں مغربیت کے بُرے پہلوؤں پر نکتہ چینی کی وہاں اس کے اچھے پہلوؤں کو سراہا بھی۔ اسی طرح دیوبند نے نظریات اور طریقہ کار میں فرق ہونے کے باوجود سید احمد خاں پر نکتہ چینی میں اوچھے ہتھیاروں اور سنگ باری کا مظاہرہ نہیں کیا۔(۶۶)

اس ردعمل کا ایک اہم پہلو سیاسی بھی تھا۔ سید احمد خاں پر انگریزوں کا ایجنٹ اور مہرہ ہونے کا الزام بھی تھا۔ چنانچہ جو لوگ برعظیم کی آزادی اور خودمختاری کے حامی تھے اور انگریزوں کو برعظیم سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے انھوں نے بھی انگریز مخالفت کے ساتھ ساتھ سید احمد خاں کی مخالفت کو بھی اپنے مشن کا حصہ بنالیا۔

علی گڑھ تحریک کی مخالفت اور ردعمل میں کئی نامور لوگ، رہنما، صحافی، ادیب اور شاعر، بالواسطہ یا بلاواسطہ، شریک تھے۔ اس ردعمل کا اثر خاصے وسیع دائرے تک پھیل گیا اور سید احمد خاں کی وفات کے بعد خاصے عرصے تک اس ردعمل اور مخالفت کے اثرات رہے اور ان اثرات کی توسیع سے ردعمل کا ایک باقاعدہ دور سامنے آیا۔ اس ردعمل کے دور کی بھی کچھ خصوصیات تھیں۔ مثلاً اس دور میں مذہب کا احیا ہوا۔ مذہب سے بیگانگی کم ہوگئی۔ دوم مغرب کی تقلید اور نقالی کے

خلاف زبردست ذہنی فضا تیار ہوگئی۔ سید احمد خاں اور ان کے بعض رفقا کو مغرب سے ایک حسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم اور تہذیب سے ان کی بعض توقعات محض لاعلمی، خوش فہمی اور عقیدت پر مبنی تھیں۔(۶۷) کیوں کہ وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے۔

علی گڑھ تحریک کے خلاف پیدا ہونے والے اس ردِعمل نے ادب پر ایک اثر یہ بھی ڈالا کہ ادب میں ایک مقصد اور نظریے کے تحت مزاح تخلیق کیا گیا۔ علی گڑھ تحریک اور اس کے تضادات و نقائص نے نہ صرف اس مزاح کی تخلیق کے لیے پس منظر فراہم کیا بلکہ مزاحیہ ادب کو ایک نیا لہجہ اور نیا ذخیرۂ الفاظ فراہم کیا۔ جدید و قدیم تصورات اور دو تہذیبوں کی جو کشمکش سماجی اور سیاسی میدانوں میں پائی جاتی تھیں وہ ادب میں بھی پوری شدت سے جھلکنے لگی اور ''اودھ پنچ'' نے اس میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ گو اردو مزاح میں سماج، نظریات اور مسائل کی عکاسی کا آغاز نذیر احمد کر چکے تھے لیکن ''اودھ پنچ'' نے اسے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت دے دی۔ مغربیت اور مادیت کا جو سیلاب اُمڈ رہا تھا نذیر احمد کی طرح ''اودھ پنچ'' نے بھی اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

''اودھ پنچ'' اور مزاح نگاری

علی گڑھ تحریک کے خلاف ردِعمل کے اظہار میں ''اودھ پنچ'' پیش پیش تھا۔ یہ ایک مزاحیہ جریدہ تھا جو لکھنؤ سے ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو جاری ہوا۔(۶۸) یہ ہفت روزہ تھا اور اس کے مدیر منشی سجاد (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۱۵ء) تھے جو خود بھی مزاح نگار تھے بلکہ ''اودھ پنچ'' کے لکھاریوں میں غالباً سب سے بسیار نویس وہی تھے اور ''اودھ پنچ'' کے شذرات، اداریوں اور مضامین کا خاصا بڑا حصہ انھی کے قلم کا رہینِ منت ہوتا تھا۔

''اودھ پنچ''۔ ''پنچ'' (۶۹) سے متاثر ہو کر جاری کیا گیا تھا۔ ''پنچ'' لندن سے نکلنے والا ایک ہفت روزہ تھا جس کا پہلا شمارہ ۱۷ جولائی ۱۸۴۱ء کو نکلا تھا اور یہ سیاسی و سماجی طنز، مزاح اور ادبی تنقید کے لیے مخصوص تھا۔(۷۰)

''اودھ پنچ'' اردو کا پہلا مزاحیہ جریدہ نہیں تھا۔ اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار ''مذاق'' تھا جو رام پور سے ۷ جنوری ۱۸۴۵ء کو جاری کیا گیا۔(۷۱) اسی طرح لفظ ''پنچ'' بھی ''اودھ پنچ'' نے برعظیم میں پہلی بار استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ اس سے قبل چند ایک اخبارات کے نام کا حصہ رہ چکا تھا۔ البتہ ''اودھ پنچ'' نے مزاحیہ صحافت کو اتنی ترقی اور مقبولیت عطا کی کہ ''اودھ پنچ'' کی تقلید میں کئی ''پنچ اخبارات'' جاری کیے گئے اور ''پنچ اخبارات'' کے اجرا کا یہ سلسلہ لگ بھگ بیسویں صدی کے آغاز تک چلتا رہا۔(۷۲) لیکن ''اودھ پنچ'' جیسی مقبولیت اور شہرت کسی کے حصّے میں نہ آئی۔

''اودھ پنچ'' خاصے طویل عرصے تک نکلتا رہا۔ اس کا آخری شمارہ ۱۹ دسمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا۔(۷۳) کچھ عرصے بعد ''اودھ پنچ'' دوبارہ جاری کیا گیا اور اس کا دوسرا دور بھی آیا جس کا تذکرہ آگے چل کر ہوگا۔

اپنے پہلے دور میں ''اودھ پنچ'' کچھ عرصے تک تنہا نہ نکل سکا اور اسے منشی سجاد حسین نے لکھنؤ کے ہفت روزہ ''آزاد'' میں ضم کر دیا تھا اور یہ اس صورت میں دو سال تک چھپتا رہا۔(۷۴) ''اودھ پنچ'' کا انداز کبھی کبھی خاصا غیر رسمی اور اتفاقی سا ہو جاتا تھا اور اس میں صورت اور معنوی لحاظ سے جو اغلاط یا خامیاں رہ جاتی تھیں ان کی تصحیح اگر کبھی کی بھی جاتی تھی بڑے غیر سنجیدہ انداز میں۔ حتیٰ کہ اس کی اشاعت میں ایک دو روز کے تعطل کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی۔(۷۵) ''اودھ پنچ'' کے اس لاابالی پن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ''آزاد'' میں ضم ہونا زیادہ عجیب نہیں لگتا۔

''اودھ پنچ'' کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صحافت کو محض تجارت بنائے رکھنے کی بجائے اسے ایک باقاعدہ مسلک دیا اور صحافت کو ایک مشن بنا دیا۔ ''اودھ پنچ'' نے ایک باقاعدہ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر پیش کیا۔

سیاسی لحاظ سے ''اودھ پنچ'' آزادیٔ ہند اور کانگریس کا حامی تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اور شیعہ سنّی اتحاد (۷۶) کی بھی حمایت کرتا تھا جب کہ علی گڑھ تحریک کی اس نے شدید مخالفت کی۔ البرٹ بل (۷۷) کا حامی لیکن تعلیمِ نسواں، انکم ٹیکس اور الحاقِ اودھ کا بھی ''اودھ پنچ'' مخالف تھا

اور اس سلسلے میں ''اودھ پنچ'' نے باقاعدہ تحریری محاذ کھولے تھے۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاسی وقائع پر ''اودھ پنچ''، مخصوص انداز میں تبصرے کرتا تھا۔

تہذیبی اور سماجی لحاظ سے دیکھا جائے تو ''اودھ پنچ'' نے مختلف مواقع اور تہواروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مثلاً نیا سال، نوروز، سردی، گرمی، برسات، ہولی، محرم، رمضان، بقرعید، عید، بسنت اور رسوم و رواج پر ''اودھ پنچ'' میں مضامین اور نظمیں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔

''اودھ پنچ'' کا دور تہذیبی تصادم کا دور تھا۔ مغربی اور مشرقی تہذیبیں باہم ٹکرا رہی تھیں۔ انگریز ملکی سیاست پر چھا رہے تھے اور انگریزی تہذیب رفتہ رفتہ ہر چیز پر چھاتی جا رہی تھی۔ مشرق کے زوال کی وجہ سے ہر مشرقی چیز مفتوح اور زوال پذیر نظر آتی تھی۔ ہر مغربی چیز کے لیے رغبت اور مشرقی چیز کے لیے بیگانگی پائی جاتی تھی۔ ''اودھ پنچ'' اس صورتِ حال میں سامنے آیا۔ اس نے ایک طرف تو مشرق کی برائیوں اور ان کے اسباب کے خلاف بات کی اور دوسری جانب مغرب کی سطحی تقلید اور پرستش کے خلاف آواز بلند کی (۷۸) ''اودھ پنچ'' نے یہ کام طنز اور ظرافت کے پیرائے میں کیا۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ ''اودھ پنچ'' کے حربے اوچھے تھے۔ اس کا مزاح پھبتی اور ہجو پر مبنی اور اخلاقیات کی حدود سے باہر تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ''اودھ پنچ'' کے مزاح کا معیار اعلیٰ نہ تھا۔ (۷۹)

''اودھ پنچ'' کا ذاتیات میں الجھنا خاص طور پر ناپسندیدہ ٹھہرتا ہے۔ ''اودھ پنچ'' نے اپنے زمانے کے مشہور لکھنے والوں کے خلاف جو قلمی جنگ شروع کی تھی اس میں کسی حد تک ذاتیات اور عناد کا رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً ''اودھ پنچ'' نے مولانا الطاف حسین حالی کے خلاف جو رویہ رکھا وہ افسوسناک ہے۔ (۸۰) دراصل حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر لکھنؤ کے رنگ سخن پر جو زبردست نکتہ چینی کی تھی اس سے شاید لکھنؤ اسکول کے سخن فہم اور سخن ور چراغ پا ہو گئے تھے۔ (۸۱) اور انھوں نے حالی کے خلاف محاذ بنا لیا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی گئی۔ اسی طرح چکبست (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۲۶ء) اور شرر کا معرکہ بھی قابلِ غور ہے۔ ''مثنوی گلزارِ نسیم'' پر ان دونوں حضرات کی بحث و تمحیص میں منشی سجاد حسین مدیر ''اودھ پنچ'' بھی

چکبست کی طرف ہو گئے تھے۔(۸۲)''اودھ پنچ'' کا یہ رنگ ظرافت جو طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر مبنی تھا سرشار، حالی اور داغ (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) وغیرہ کے خلاف مضامین میں بھی ابھرتا ہے۔(۸۳) اسی طرح معاصر اخبارات مثلاً ''طوطی ہند'' اور بالخصوص ''اودھ اخبار'' کے خلاف ''اودھ پنچ'' نے محاذ بنالیا اور ''اودھ اخبار'' کو بنیا اخبار کا خطاب دیا۔(۸۴)

''اودھ پنچ'' کا انداز احتساب بھی غور طلب ہے۔ اس ضمن میں مرزا محمد عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو مصنفہ: سکسینہ) لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ'' کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسی طرح ڈرتے تھے جیسے شوخ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنما چہرہ صفحات اودھ پنچ کے مجلّے آئینے میں دیکھتا تو اپنی ڈراونی صورت سے ڈر کر بُرے افعال سے توبہ کر لیتا اور اودھ پنچ کا سالانہ خریدار بن جاتا۔ اس طرح ہم خرما و ہم ثواب کے اصول پر خود ''اودھ پنچ'' کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو جاتے تھے۔ ع: وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب اُلٹا۔(۸۵)''

''اودھ پنچ'' کے لیے ''ڈنڈے باز مولوی'' کی تشبیہ تو بہت خوب ہے لیکن طنز و مزاح کا کام لاکھ احتساب و تنقید اور معاشرے کی تادیب کا کام ہونے کے باوجود لاٹھی چارج بہر حال نہیں ہے۔ ناصح کو کسی بھی صورت میں ڈنڈے بازی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح اچھے استاد مکتب کے شوخ لڑکوں کو بغیر ڈنڈے بازی کے ہی حسنِ تدبر اور حسنِ تکلم سے قابو کر لیتے ہیں اور انھیں تہذیب و شائستگی سے آشنا کر دیتے ہیں اسی طرح ایک اچھا مزاح نگار بھی حسن ہے اور اس میں بھی ذاتیات سے بچتا ہے۔ ویسے بھی تہذیب اور شائستگی سکھانے کے لیے غیر شائستگی اور غیر دانش مندی کو بروئے کار لایا جائے تو یہ عمل ''دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت'' کے مصداق ہو جائے گا۔ ''اودھ پنچ'' جو معاشرے کی ناپسندیدہ اقدار کے خاتمے کے لیے کوشاں تھا اپنے اس غیر ثقہ اور غیر شائستہ طرز عمل کی وجہ سے اسی خود تکذیبی کا شکار ہو گیا۔

اگر مرزا صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ ''اودھ پنچ'' کے احتساب کے خوف سے لوگ

اس کے سالانہ خریدار بن جاتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''اودھ پنچ'' لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رقم وصول کرتا تھا۔ یہ مرزا صاحب کا حسن ظن ہے کہ وہ بدکردار شخص ''بُرے افعال سے توبہ کرلیتا۔'' اصل اہمیت اس ٹکڑے کی ہے کہ: ''اور اودھ پنچ کا سالانہ خریدار بن جاتا۔'' گویا جو لوگ ''اودھ پنچ'' کے سالانہ خریدار بن جاتے تھے انھیں نیک اور تائب سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرز عمل کو ڈرا دھمکا کر زبردستی سالانہ خریدار بنانے کے حربے کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ ''اودھ پنچ'' کے صفحات پر نادہندگان کے نام ادارتی نوٹ شائع ہوا کرتے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ سالانہ خریدار بقایاجات ادا کردیں ورنہ ان کے نام اخبار میں شائع کردیے جائیں گے۔ اس قسم کے نوٹس اور نادہندہ سالانہ خریداروں کے نام اس دور کے اکثر اخبارات میں شائع ہوا کرتے تھے اور یہ ایک عام بات تھی۔ مگر یہ ایک طرح کا جبر تھا اور لوگوں کو مجبوراً سالانہ خریدار بننا پڑتا تھا۔ لیکن ''اودھ پنچ'' ایک طرف تو ایسے اخبارات کی مذمت کیا کرتا تھا اور دوسری طرف خود اس کے صفحات پر ایسے دھمکی آمیز نوٹ چھپتے تھے۔ مثلاً ''نادھندہ خریدار اور اخبار'' کے عنوان سے ایک نوٹ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۹ء کے ''اودھ پنچ'' میں صفحہ ایک پر شائع ہوا جس میں دہلی کے ''اخبار الاخیار'' کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح اس اخبار نے بعض والیان ملک، دیسی رؤسا اور امرا کا نام نادہندگان کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ پھر صفحہ دو پر تحریر ہے: ''ہر چند کہ ہم کو اپنے قدردانوں اور معاونوں سے بفضلہٖ اس قسم کی شکایت نہیں تاہم ہمارا التماس ہے کہ وہ اس مضمون کو ذری توجہ سے معائنہ فرمائیں گے۔(۸۶)''۔ ''اودھ پنچ'' کے اس عجیب و غریب رویّے کو کیا نام دیا جائے؟

یہ تو تھا ''اودھ پنچ'' کا سرسری تعارف۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کی مخالفت میں کیسا لکھا اور کیا نقطۂ نظر پیش کیا۔

''اودھ پنچ'' کے مزاح نگار اور ان کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر

''اودھ پنچ'' نے نثر کے علاوہ نظم میں بھی مزاح کے نمونے پیش کیے بلکہ ''اودھ پنچ'' کی نظم کسی طرح بھی اس کی نثر سے کم نہ تھی اور اس نے اردو کی مزاحیہ شاعری میں یادگار نمونے

چھوڑے ہیں۔ لیکن ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے ''اودھ پنچ'' کے نثر نگاروں کے ذکر تک محدود رہیں گے۔

''اودھ پنچ'' کے نمایاں نثر نگاروں میں مدیر منشی سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزاد، مچھو بیگ ستم ظریف، اکبر الٰہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق اور احمد علی شوق وغیرہ شامل تھے۔ ان کے مزاح کے سیاسی اور سماجی پہلوؤں کا ہم فرداً فرداً جائزہ لیں گے۔

منشی سجاد حسین (۱۸۵۶ء۔۱۹۱۵ء)

منشی سجاد حسین (۸۷) صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ''احمق الذین''، ''پیاری دنیا'' (۸۸) (۱۹۰۸ء)، ''حاجی بغلول''، ''کایا پلٹ'' اور ''میٹھی چُھری'' شامل ہیں جب کہ ''حیاتِ شیخ چلّی'' (۱۳۱۹ھ۔۱۹۰۱ء) (جو منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی تصنیف ہے) اور ''طرح دار لونڈی'' (۱۹۰۴ء) (جو طرار لکھنوی کا ڈراما ہے) کو بھی ان سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے ''اودھ پنچ'' میں بے شمار مضامین لکھے۔ بلکہ ''اودھ پنچ'' کی نگارشات کا خاصا بڑا حصہ انھی کے قلم سے ہوتا تھا۔ وہ اداریے کے علاوہ مختلف شذرات اور مضامین نام بدل بدل کر لکھتے تھے اور ہمارا اندازہ ہے کہ انھوں نے بے شمار فرضی ناموں سے لکھا ہے۔ مثال کے طور پر ''اودھ پنچ'' میں خاصی تخلیقات ''مضامینِ غیر'' کے زیرِ عنوان شائع ہوتی تھیں اور ان پر ''اودھ پنچ'' کے مختلف قلم کاروں مثلاً نواب سید محمد آزاد اور ستم ظریف وغیرہ کے نام ہوتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی سجاد حسین کے سوا تمام لکھنے والوں کی تحریریں اس عنوان کے تحت چھاپی جاتی تھیں جب کہ بقیہ مضامین جو ابتدائی صفحات پر ہوتے تھے خود منشی سجاد حسین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی حتمی یا خارجی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔ صرف طرزِ تحریر سے (جو منشی سجاد حسین سے ملتا جلتا ہے) اور ''مضامین غیر'' کے عنوان سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی سجاد حسین ایک طویل عرصے تک فرضی ناموں سے تخلیقات کے انبار لگاتے رہے۔

منشی سجاد حسین نے لکھنؤ کا ماحول بہ چشم خود دیکھا تھا۔ لکھنؤ کا تہذیبی ورثہ ان کے خون میں تھا۔ انگریزی اقبال کا سورج بلند ہو رہا تھا اور برعظیم کی تہذیب کا زوال بھی تیز تر ہو رہا تھا۔ برعظیم سیاسی طور پر انگریزوں کا محکوم تھا اور انگریزی تہذیب بھی برعظیم کو فتح کرنے لگی تھی۔ منشی سجاد حسین برعظیم کی تہذیب کے علم بردار بن گئے تھے۔ انگریزوں اور علی گڑھ سے ان کو فکری اختلافات تھے۔ چوں کہ طبعاً ظریف اور بذلہ سنج تھے لہٰذا یہ اختلاف ''اودھ پنچ'' کے صفحات پر طنز اور مزاح کے پیرائے میں پیش کیا اور ناولوں میں بھی یہی انداز برقرار ہے۔

منشی سجاد حسین کے مزاح پر دو باتوں نے خاصا گہرا اثر ڈالا۔ ایک تو لکھنؤ کا ماحول جس میں ضلع جگت، رعایت لفظی اور ایہام خوب پھل پھول رہے تھے اور دوسرا مغربی ادب اور ڈکنس (Dickens) (۱۸۱۲ء۔۱۸۷۰ء) کا مزاح۔ ان دونوں عوامل نے سجاد حسین کے مزاح پر اس طرح اثرات مرتب کیے کہ لکھنؤ کے ماحول نے تو ان کی تحریر میں ضلع جگت، لفظی رعایتیں اور لکھنؤ کے محاوروں اور زبان کے مخصوص استعمال کو فروغ دیا اور مغربی ادب کے مزاح کے اثر سے انھوں نے ''اودھ پنچ'' جاری کیا (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا کہ یہ ''لندن پنچ'' کے اتباع میں جاری کیا گیا) نیز مغرب کے ناولوں سے متاثر ہو کر ان کے انداز مزاح کا نمونہ اردو میں منتقل کیا۔ سرشار کی طرح وہ بھی سروانتے (Cervantes) (۱۵۴۷ء۔۱۶۱۶ء) کے ناول ''ڈان کوئک زوٹ'' (Don Quixote)(۸۹) (پہلا حصّہ ۱۶۰۵ء میں اور دوسرا ۱۶۱۵ء میں) سے متاثر ہوئے۔ ''حاجی بغلول'' پر ڈکنس کے ''پک وک پیپر'' (Pickwick Papers) (۱۸۳۶ء۔۳۸) کا بھی اثر ہے۔ ''ڈان کوئک زوٹ'' (Don Quixote) اور سانچو پانزا (Sancho Panza) سرشار کے ہاں آزاد اور خوجی بن جاتے ہیں اور سجاد حسین کے ہاں حاجی بغلول اور حرفہ ریوڑی۔ ''ڈان کوئک زوٹ'' کا نیزہ سرشار کے ہاں قرولی اور سجاد کے ہاں جریبِ زیتونی بنتے ہیں۔ جس طرح ڈکنس نے پک وک کو مختلف مقامات پر بوکھلاہٹ اور حماقتوں سے گزار کر مزاح پیدا کیا ہے اسی طرح حاجی بغلول کو سجاد حسین نے بوکھلاہٹ، زودرنجی اور حماقت میں مبتلا دکھایا ہے البتہ حاجی بغلول کو ہمارے معاشرے اور ماحول میں رکھ کر تبدیلیاں پیدا کی گئی ہیں۔(۹۰)

حماقتوں اور مضحکہ خیز حرکتوں کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیز حُلیہ بھی سجاد حسین کے مزاح پیدا کرنے کے طریقوں میں شامل ہے۔ اکثر مقامات پر سجاد حسین کے مزاح کا انداز (بالخصوص ''حاجی بغلول'' میں) کیلے کے چھلکے پر سے پھسلنے والے آدمی کو دیکھ کر ابھرنے والے قہقہے کا سا ہے۔(۹۱) یہ مزاح درد اور الم لیے ہوئے ہے۔ یہ کسی کے تکلیف میں مبتلا ہونے، بدصورتی یا بے سروپا حلیے سے پیدا کیا گیا مزاح ہے۔ اس قسم کے مزاح کو اعلیٰ مزاح کہنا مشکل ہے۔ منشی سجاد حسین کے ایہام اور ضلع جگت سے پیدا کیے گئے مزاح کا معیار بھی زیادہ بلند نہیں۔ البتہ وہ جب کسی خیال یا لفظ کے مخصوص استعمال، اپنے لب و لہجے اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں تو اس کا معیار بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ لفظی پیوند، مضحک تشبیہات اور تحریف بھی ان کے ہتھیار ہیں۔ البتہ رکاکت اور ابتذال کہیں کہیں جھلک کر تہذیب و اخلاق کی اصلاح کے دعوؤں کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔

منشی سجاد حسین کے ہاں طنز بھی خاصا ملتا ہے اور بعض مقامات پر انھوں نے طنز کے نہایت کامیاب اور اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ جو فرضی خطوط انھوں نے گلیڈ اسٹون (۹۲)، ملکہ وکٹوریہ اور مختلف ریاستوں کے سربراہوں وغیرہ کے نام لکھے ان میں ان کے مزاح کا انداز بدل جاتا ہے۔ یہاں وہ پُرلطف گفتگو اور طنزیہ تبصرے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ زبان پر عبور اور محاوروں کے استعمال سے انھوں نے بہت کام لیا ہے۔

''لوکل'' کے عنوان سے ''اودھ پنچ'' میں منشی سجاد حسین نے موسم کا احوال قلم بند کیا ہے اور اس کے پردے میں عام حالات اور واقعات کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کی بڑی شہرت ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں مزاح کبھی کبھار ہی ہوتا تھا اور زیادہ سے زیادہ انھیں دلچسپ ہی کہا جاسکتا ہے۔

خلطِ مبحث اور طول طویل بیانات نے سجاد حسین کے مزاح کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ایک تو یہ طویل کلام اس دور میں روا اور رائج تھا۔ دوم پینتیس سال تک ہر ہفتے وہ تازہ بہ تازہ اور مزاحیہ نثر بھلا کہاں سے لاتے جب کہ موضوع بھی زیادہ وسیع نہ تھا اور خود کو اور ''اودھ پنچ'' کو انھوں نے عام حالات اور واقعات اور مشرق و مغرب کے تہذیبی تفاوت تک محدود کر رکھا تھا۔ ''اودھ پنچ''

کے دیگر لکھنے والوں کی طرح ان کے ہاں بھی جھاڑ جھنکاڑ کی کثرت ہے۔

ان کے بے شمار قلمی ناموں نے ان کے فن پر تبصرے کو محدود کر دیا ہے۔ کیوں کہ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ فلاں فلاں قلمی نام یا مخفف انھی کا ہے بالخصوص جب کہ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں میں سے اکثر یا تو فرضی نام سے لکھتے تھے یا صرف تخلص اور مخفف استعمال تھے۔

سجاد حسین کے مزاح کا بڑا حصہ سید احمد خاں، انگریز، نیچریت، علی گڑھ اور مغربی تہذیب سے فکری اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ملکی و غیر ملکی سیاست اور عام واقعات و حالات بھی ان کے مزاح کی زد میں آئے۔ ''اودھ پنچ'' میں شائع ہونے والے ان کے اکثر مضامین وقتی اور ہنگامی نوعیت کے موضوعات پر ہیں۔ اخباری تقاضوں سے ان کا مزاح صحافیانہ بھی ہو جاتا ہے مگر ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں کو بنیادی طور پر ادب ہی سمجھنا چاہیے۔ سجاد حسین بھی ادیب پہلے تھے اور صحافی بعد میں۔

سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور مرتے دم تک حامی رہے۔ ان میں اور سید احمد خاں کے نظریات میں قطبین کا فرق ہے۔ سجاد حسین انگریزوں کے مخالف اور انگریزی تہذیب سے بیزار تھے۔ جب کہ سید احمد خاں انگریزوں سے مفاہمت کے حامی اور ان کی تہذیب سے مرعوب تھے اور چاہتے تھے کہ برعظیم کے باشندے بھی اس کا ''کامل ترین سویلزیشن'' (سید احمد خاں کے الفاظ میں) کو اپنا لیں۔ چنانچہ سجاد حسین انگریزوں اور سید احمد خاں پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔ ''حاجی بغلول'' میں جب حاجی صاحب بیرسٹر صاحب کی کوٹھی سے نکلتے ہیں اور بیرسٹر کا کتا انھیں کاٹ لیتا ہے وہاں لکھتے ہیں: ''صاحب کا ڈیئر کتا جو بہت مُنھ لگا تھا (یعنی مُنھ چاٹ لیا کرتا تھا)۔(۹۳)''

''احمق الذین'' میں بھولے نواب کا ''رفارمر'' بن جانا، مغربی تہذیب کو اپنانا اور بالآخر پاگل ہو جانا بھی ایک طرح سے رفارمروں اور سید احمد خاں پر طنز ہے۔ منشی سجاد حسین ایک جگہ شیطان سے کہلواتے ہیں: ''نیچر کی باتوں سے آگاہ ہونے کو ہمارا ظرف اور ہماری سی قابلیت درکار ہے۔(۹۴)'' اور اس طرح سید احمد خاں کی نیچریت پر طنز کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ''اودھ پنچ'' کے صفحات پر سید احمد خاں پر ہر قسم کا طنز اور تضحیک تک روا رکھی۔

سجاد حسین روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم واقعات میں جب کوئی غیر اصولی بات دیکھتے تو اس کے بھی پیچھے پڑ جاتے۔ اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اربابِ اقتدار کا خوف کیے بغیر حق بات کہتے اور اصول کی خاطر چھوٹی سی بات پر بھی ''اودھ پنچ'' کے صفحات میں ایک بحث سی چل پڑتی۔ اس ضمن میں کیننگ کالج لکھنؤ کا ایک واقعہ اور سجاد حسین کا اس پر ردعمل مثلاً پیش کیا جاسکتا ہے۔

کیننگ کالج لکھنؤ کا مشہور کالج تھا۔ خود منشی سجاد حسین نے بھی کچھ عرصے وہاں تعلیم پائی تھی۔ وہاں امتحان میں دھاندلی کا ایک واقعہ منظرعام پر آیا جس میں شاہجہاں پور کے رئیس موتی میاں کا بیٹا محمد اطہر ایف۔ اے کے امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ تب ہوائٹ نامی ایک انگریز کیننگ کالج کا پرنسپل تھا جس نے اس واقعہ کو دبانے کی کوشش کی۔ منشی سجاد حسین اس بے اصولی پر خاصے برافروختہ نظر آتے ہیں اور ''اودھ پنچ'' کے صفحات پر کچھ عرصے تک اس موضوع پر طنزیہ پیرائے میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہا۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> ''افسوس صد افسوس یہ ہندوستان ہے جہاں ہوائٹ صاحب کو اطمینان ہے کہ گورے چمڑے والے پوجے جاتے ہیں... اور جتلا دے کہ پبلک کی گاڑھی کمائی سے لمبی لمبی تنخواہیں اینٹھنا اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں باس کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔(۹۵)''

اس واقع کے کچھ عرصے بعد (غالباً اس تنازع کا فیصلہ ہوتے پر) ایک پُرلطف اعلان سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' میں شائع کیا:

افسوسناک حادثۂ عظیم

> حق پسندانِ پاک نفس جس قدر ماتم کریں بجا اور دیانت دارانِ انصاف دوست جس قدر گریہ و بکا مچائیں زیبا کہ ہمارے لوکل کالج کی نیک نامی جو تین مہینے سے عارضۂ محمد اطہری کے ہاتھوں سخت شدائد اٹھا رہی تھی جان سے گزر گئی۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ نے تغافل کا زہر دیا۔ انجمن ہند کی حماقت نے پاؤں پکڑے اور پرنسپل کالج کی فربودیت نے

چپ چپاتے گلا گھونٹ دیا۔ جزاک اللہ۔ (۹۶)''

یہاں سجاد حسین کی بے باکی اور اصول پسندی جھلکتی ہے۔ پرنسپل کے باوجود انگریز ہونے کے انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت اور انجمن ہند کو بھی طنز کو لپیٹ میں لے لیا۔ کیوں کہ اس ناانصافی پر ان کی خاموشی پر سجاد حسین مطمئن نہ تھے۔

البتہ ''اودھ پنچ'' میں کئی انگریزوں کی تعریف بھی ملتی ہے۔ مثلاً ۱۶ جنوری ۱۸۹۰ء کے پرچے میں ''محبانِ ہند'' کے عنوان سے ایک قلمی تصویری خاکہ شائع کیا جس میں ہیوم (۹۷) اور بریڈلا (۹۸) کو محبانِ ہند میں شامل کیا گیا ہے۔ (۹۹) یہ ''اعزاز'' ہیوم کو غالباً انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کے صلے میں اور بریڈلا کو اہل برعظیم کا حامی ہونے کی بنا پر دیا گیا ہے۔ کانگریس کا حامی ہونے کی بنا پر سجاد حسین کا یہ رویہ بعید از فہم نہیں۔ لیکن یہ چیز بہرحال اس بات کی غماز ضرور ہے کہ سجاد حسین کی صحافت اصولوں پر استوار تھی۔

عام واقعات پر ''لوکل'' کے عنوان سے وہ جو تبصرہ کرتے تھے اس پر موسم کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے شہری مسائل کا بھی تذکرہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی ان کا تبصرہ نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ مثلاً محصولات میں اضافے پر لکھتے ہیں:

> ''ایک صاحب اپنے پڑوسی کی گائے کے مرنے کی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے۔ اتفاق سے انھی کا گدھا مر گیا۔ جھلا کر آپ کیا فرماتے [ہیں] ''سبحان اللہ چندیں مدت خدائی کردی گاؤ خر را نشاختی۔'' اسی طرح غلّے کی نگرانی کا رونا تھا۔ ہمارے لیفٹیننٹ گورنر نے پانی کا نل ایسا تجویز کرایا کہ میونسپلٹی نے علاوہ پانی کے ٹیکس کے اور بہت سے محصولات چنگی بڑھا دیے۔ سبحان اللہ چندیں مدت حکومت کردی غلہ و آب را نشاختی۔ (۱۰۰)''

سجاد حسین ''اودھ پنچ'' کے اور لکھنے والوں کی طرح برعظیم کے ماحول اور سماج اور بالخصوص اودھ کے سماجی حالات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ برعظیم کی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں ان کے ہاں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ جیسے ''حاجی بغلول'' میں جب حاجی صاحب گھوڑی خریدنے کا ارادہ

کرتے ہیں وہاں ان کے اشتیاق کا عالم اس طرح واضح کیا ہے:

''رات تو اس شوقین کی طرح جس کو صبح عید یا لکھنؤ کے چہلم، یا میرٹھ کی نوچندی یا چھتر کے میلے یا کلکتے کے فینسی فیئر کی خوشی ہو، ہزاروں دل خوش کن منصوبوں اور امید کے چھلاووں کے تعاقب میں کٹی۔(۱۰۱)''

ملکی اور عالمی سیاسی بھی سجاد حسین کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم گلیڈ سٹون (۱۰۲) ملکہ وکٹوریہ، مہاراجہ کشمیر، نظام دکن وغیرہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں بظاہر تو ان میں وہ مشورے دیتے اور غلطیاں نکالتے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ عالمی اور ملکی سیاسی واقعات اور حالات پر تبصرہ ہے۔ آج ان کی بعض باتیں مثلاً روس، افغانستان، برطانیہ، مصر، ترکی، اٹلی کے حالات، فلاں لیڈر، فلاں جنرل، فلاں لارڈ یا زار روس اور مہدی سوڈانی (۱۰۳) کے تذکرے کچھ عجیب اور دور از کار لگتے ہیں۔ لیکن یہ اس دور کے اہم مسائل تھے اور اہل برعظیم بالخصوص برعظیم کے مسلمانوں کو اپنے مخصوص سیاسی اور مذہبی رجحانات کی بنا پر ان سے دلچسپی بھی تھی۔ مثلاً افغانستان کے مسئلے پر برطانوی وزیر اعظم کو فرضی خط میں لکھتے ہیں:

''مولوی گلیڈ اسٹون طولعمرہ

... دوسری خطا یہ ہوئی کہ جب معلوم تھا کہ افغانستان پر ہم قبضہ نہیں رکھ سکتے۔ اس میں آمدنی نہ منافع۔ قوم پرورش پاسکتی ہے نہ تجارت چل سکتی ہے تو پھر شیر علی خاں سے لڑنا اور کابل قندھار فتح کرنا ہمارا فضول تھا۔(۱۰۴)''

برعظیم کی ریاستوں اور رجواڑوں کے دگرگوں حالات، ان کے سربراہوں کی بدانتظامیاں، فضول خرچیاں اور عیاشیاں (جو ان کے زوال کے اسباب میں سے تھیں) سجاد حسین کا موضوع بنتی ہیں۔ مثلاً: ''نواب صاحب سے جو خدا کے ہاں سے پرونوٹوں اور تمسکوں پر دستخط کرنے کا ٹھیکہ لے آئے تھے پرونوٹ لکھا، بخیر و عافیت گھر کا راستہ لیا۔(۱۰۵)''

ریاستوں میں انگریز ریزیڈنٹوں کے تقرر کا تذکرہ یوں کیا:

''آج کل ریذیڈنٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے۔ تمھاری جو حالت نہ ہو کم ہے... والیان ملک کچھ آئے دن تو مرتے ہی نہیں غالبًا لوہا گرم ہے پیٹا جائے، مگر تم کو میں ایک گُر بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کرنا مگر اوسان نہ کھونا۔ قیام ریذیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے... اب تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تم کو انگریزوں کے سپرد کرتا ہوں۔(۱۰۶)''

آخری سطر میں کیا گیا طنز قابل غور ہے۔ نظام دکن کے نام ایک خط میں کہتے ہیں: ''دنیا میں ریاست کے انتظام کے واسطے نوکر چاکر ہوتے ہیں مگر تھوڑے عرصے سے ریاست نوکری چاکری کے واسطے ہوگئی ہے۔(۱۰۷)''

یہاں دکن میں آئے دن کی نئی ملازمتوں اور اُن میں تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔ سجاد حسین کی تصنیفات میں کئی جگہ انگریزی الفاظ، انگریزوں کے تذکرے اور انگریز کردار دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ان کے دور میں انگریز حکومت اور انتظامات پر کس حد تک چھا چکے تھے)۔ جہاں تک انگریزی الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے تو سجاد حسین، نذیر احمد اور حالی کے برعکس انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال نہیں کرتے۔ ان کے ہاں انگریزی الفاظ عمومًا وہیں ملتے ہیں جہاں ان کا مناسب اور رائج اردو مترادف تلاش کرنا مشکل ہو یا پھر حالات اور کردار نگاری کا تقاضا ہو، مثلاً کسی انگریز کردار کے مُنھ سے یا کسی مغربیت زدہ مقامی باشندے کے کردار کو واضح کرنے کے لیے (مثال کے طور پر ''احمق الذین'' میں میر صادق کو معمولی پڑھا لکھا لیکن انگریزی الفاظ بولنے کا شائق دکھایا ہے۔) سجاد حسین کے ہاں اس قسم کے انگریزی الفاظ ملتے ہیں: سرٹیفکیٹ، بائیسکل، چیرمین، پریسیڈنٹ، ٹیلی گراف، ٹیکس، گورنر، کمیشن وغیرہ۔ البتہ کبھی کبھار وہ انگریزی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی الفاظ جوڑ کر کوئی ترکیب گھڑ لیتے ہیں۔ جیسے ''سرٹیفکیٹ یافتہ''، ''حق کمیشن'' وغیرہ۔ لیکن یہ شاید مزاح پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ''لٹاڑیدہ'' اور ''مضامین غیر کمیونی کیٹڈ'' جیسی پیوندلگی اور اختراعی ترکیبیں اور الفاظ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی مزاح نویسی کے شوق میں سجاد حسین ذرا بے قاعدگی بھی کرجاتے ہیں۔ مثلاً ''پیاری دنیا'' جیسے تمثیلی قصے میں جو قدیم مصر کے ماحول میں پیش کیا گیا

ہے وہ ٹیکس اور بیرن راتھ چائلڈ اور لارڈ بنکیسفیلڈ کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں حالاں کہ اس سے تمثیل کا اسلوب اور تاثر متاثر ہوتا ہے۔

سجاد حسین کے مزاح کا کچھ حصہ اس چھیڑ چھاڑ پر بھی مشتمل ہے جو ''اودھ پنچ'' کے معاصر اخبارات سے چلتی تھی۔ یہ چھیڑ چھاڑ اور معاصرانہ چشمک بہرحال اس رجحان کی عکاس ضرور ہے جو اس دور کے اخبارات میں معاصرین کے ساتھ رکھے جانے والے روّیے سے متعلق ہے اور یہ اخلاقی لحاظ سے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں۔

منشی سجاد حسین کے مزاحیہ ناولوں کے بارے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کو پلاٹ کے ارتقا یا قصے کا اتنا احساس نہیں رہتا جتنا خیال سماجی تبدیلیوں کو اجاگر کرنے کا، حقائق بیان کرنے کا اور مزاح پیدا کرنے کا رہتا ہے۔ ''حاجی بغلول'' کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر ''ڈان کوئک زوٹ'' سے ماخوذ ہے۔ اس میں بھی باقاعدہ پلاٹ ندارد ہے۔ لیکن یہ لکھنؤ اور اس کے بے فکروں کی تصویر ضرور ہے۔ ''پیاری دنیا'' ایک تمثیلی قصہ ہے جو قدیم مصر کے ماحول میں ہے۔ اسے ناول کہنا بھی مشکل ہے البتہ اس میں معاصر واقعات و افراد کے بعض حوالے ملتے ہیں اور شیطان کے کردار کی مدد سے علی گڑھ تحریک کے بعض رجحانات مثلاً نیچریت وغیرہ پر طنز کیا گیا ہے۔

''احمق الذین'' ایک بہتر پلاٹ کا حامل ہے جس میں مرکزی کردار احمق الذین عرف بھولے نواب کا لکھنؤ سے دکن جا کر ہر کس و ناکس کے ہاتھوں لٹنا، بے وقوف بننا اور مغربی وضع قطع اختیار کر کے پریشان ہونا اور ''رفارمر'' بن کر بالآخر پاگل خانے پہنچ جانا بیان ہوا ہے۔ اس ناول میں مغرب پرستی اور رفارمروں پر تو طنز ہے ہی دکن اور اہل دکن پر بھی چوٹ ہے کہ وہاں پردیسیوں کو کس طرح ٹھگ لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک بڑھیا بھولے نواب کو ٹھگ لیتی ہے اور ایک مولوی صاحب بھی انھیں لوٹ لیتے ہیں جن کے پاس بھولے نواب اپنی رقم امانتاً رکھواتے ہیں اور جو روپے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''یہ دنیا کی نجاست ہے میں نہیں چھوتا۔(۱۰۹)'' اور ''ایک ایک روپیہ سانپ بچھو ہے۔ یہ کام دنیا کے کتوں کے ہیں۔ ہم اللہ والے لوگوں کو ان سے کیا واسطہ۔(۱۱۰)'' لیکن بھولے نواب کے اپنی امانت واپس مانگنے پر اسے ''بے ایمان'' کہہ

کر مسجد سے نکلوا دیتے ہیں۔ مذہبی آدمیوں اور مولویوں پر منشی سجاد حسین کا یہ طنز ان کا عمومی خیالات سے ہٹ کر ہے۔

''میٹھی چھری'' میں مزاح نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں ایک رئیس کا گھر تباہ ہونے اور اس کے خاندان کو معاشی مشکلات میں گرفتار ہوتے دکھایا گیا ہے۔ ''پیاری دنیا'' کی طرح یہ ناول بھی دلچسپی کا حامل نہیں ہے لیکن اس میں ایک ''مِس'' کی زبانی منشی سجاد حسین نے اپنے دور کے لوگوں کو پیغام دیا ہے کہ عزت کا معیار اور اشراف میں شامل ہونے کی وجہ دولت یا ریاست نہیں بلکہ محنت اور ہُنر ہے اور جو لوگ محنت اور ہُنر سے عاری ہیں وہ بھنگی اور چمار سے بھی بدتر ہیں۔(۱۱۱) پیغام یقیناً اس دور کے لوگوں کو جھنجھوڑنے کے مترادف ہے اور مغرب سے اخذ کردہ ہے۔

''کایا پلٹ'' اس لحاظ سے ایک عجیب ناول ہے کہ اس میں ایک طرف تو مصری لوح کا موکل اور اس کے کارنامے ہیں اور دوسری طرف انگریز، مصر میں مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ، سید احمد خاں، کانگریس، ہوائی جہاز اور نہ جانے کس کس کے تذکرے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس ناول میں منشی سجاد حسین کو مزاح اور پلاٹ سے زیادہ سیاسی اور سماجی حالات کو مقید کرنے کی فکر تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ''موکل'' کوٹ پتلون پہنے مسٹر جانسن کے کمرے میں اچانک نمودار ہوتا ہے اور جانسن صاحب کی یہ حالت ہے کہ:

> ''اب تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عجیب کوئی بے ڈول ہندوستانی نیمر، (۱۱۲) بے تمیز... معلوم ہوتا ہے سید صاحب کا کوئی اشکل چیلا ہے جس نے انگریزوں کی دیکھا دیکھی کوٹ پتلون تو پہننا سیکھ لیا ہے۔ مگر [آداب] اور اخلاق سے ناواقف ہے غصہ اس بنا پر اور بھی زیادہ ہو گیا کہ سید صاحب کا گروہ اس زمانے میں انٹی کانگریس ہونے کی وجہ سے کانگریس والوں کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔(۱۱۳)''

منشی سجاد حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مزاح اس دور کے اہم مسائل کو موضوع بناتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔

نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۱۶ء)

''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں میں اس کے مدیر منشی سجاد حسین کے بعد نمایاں ترین نام نواب سید محمد آزاد (۱۱۴) کا ہے۔ انھوں نے اردو کے مختلف اخبارات میں مضامین لکھے۔ فارسی اخبار میں بھی لکھا۔ (۱۱۵) کلکتے سے ایک انگریزی اخبار ''رئیس اینڈ رعیت'' نکلتا تھا۔ نواب آزاد نے اس میں اداریے اور "The Molakat" کے زیرِ عنوان طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔ (۱۱۶) ''اودھ اخبار'' میں بھی لکھا لیکن صحیح معنوں میں شہرت ''اودھ پنچ'' ہی سے ملی۔

نواب آزاد کا ڈراما ''نوابی دربار'' جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوا (۱۸۸۰ء)، ''اودھ پنچ'' میں ۱۹ اپریل ۱۸۷۸ء سے ۱۶ جولائی ۱۸۷۸ء تک قسط وار چھپتا رہا۔ (۱۱۷) ان کے ''اودھ پنچ'' میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ ''خیالاتِ آزاد'' (۱۸۷۸ء) کے نام سے ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جس میں خاصے اضافے کیے گئے تھے۔ اسے عبدالغفور شہباز (۱۸۵۷ء؟۔ ۱۹۰۸ء) نے مرتب کیا تھا۔ ''لوفر کلب'' ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی جب کہ ان کی ڈائری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ (۱۱۸)

نواب آزاد کی ایک اور قابلِ قدر تصنیف ''سوانح عمری مولانا آزاد'' ہے۔ یہ ''اودھ پنچ'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اس کی پہلی قسط ۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اور آخری قسط ۲۳ مئی ۱۸۹۰ء کو شائع ہوئی۔ (۱۱۹) کتابی صورت میں ۱۸۹۱ء میں سامنے آئی۔

نواب آزاد مغربیت کے شدید مخالف تھے۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے مغرب، مغربی تہذیب اور انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ ان پر گہرے طنز کیے۔ نواب آزاد نثر میں وہی کام کرنا چاہتے تھے جو اکبر نے نظم میں کیا۔ (۱۲۰)

البتہ یہ ضرور ہے کہ آزاد کو جہاں جہاں مشرقی تمدن، اقدار اور افراد میں عیب اور کمی نظر آئی ہے انھوں نے اس کی بھی نشاں دہی ضرور کی ہے۔ گویا یہ ایک طرح سے اپنی تہذیب کی خامیوں کا بھی اعتراف اور اہلِ وطن کی توجہ اس جانب بہ غرضِ اصلاح مبذول کرانے کی کوشش ہے۔ یہ عنصر آزاد کی تحریر میں توازن اور اعتدال پیدا کرتا ہے اور انھیں مغرب کا متعصب نقاد ہونے سے بچا لیتا ہے۔

آزاد کا بنیادی مقصد جدید وقدیم اور مشرقی اور مغربی اقدار کے درمیان اعتدال قائم کرنا اور اس افراط وتفریط سے بچنا تھا جو ان کے خیال میں علی گڑھ تحریک کے ہمنواؤں کی تقلیدِ مغربی کے نتیجے میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ مغرب کے اُمڈتے ہوئے سیلاب سے اپنی تہذیب کو بچانا چاہتے تھے چنانچہ مغرب اور اس کے تمدن کی خامیوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی تہذیب میں موجود بعض خرابیوں کی اصلاح کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی تا کہ ایک طرف تو مغربی تہذیب کے بالاتر اور کامل کرنے کا رعب جو علی گڑھ نے پیدا کیا تھا دلوں سے نکل جائے اور دوسری طرف جو ہماری اپنی کمزوریاں ہیں اور جن کے سبب تہذیبی اور ذہنی طور پر مغلوب ہو جانے کا اندیشہ ہے انھیں بھی دور کرنے کا خیال پیدا ہوجائے۔ اسی مقصدیت اور خلوص نے ان کی تحریر میں اثر، گہرائی اور خوبی پیدا کردی ہے۔

آزاد کا شمار اس دور کے نمایاں طنز نگاروں میں ہونا چاہیے۔ وہ طنز بڑی چابک دستی سے کرتے ہیں۔ لیکن ان کا طنز بڑی شگفتگی لیے ہوئے ہے۔ گو ان کے ہاں بھی کبھی کبھار تلخی آجاتی ہے، لیکن اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ ان کے ہاں تلخی زیادہ طوائف، نائکہ اور قرمساق وغیرہ کے ذکر پر آجاتی ہے۔ آزاد ڈومنی، نوچی، نائکہ اور آیا وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے نہ صرف ابتذال وفحش کی طرف بہک گئے ہیں، بلکہ تلخ بھی ہوگئے ہیں اور خاصے کبیدہ خاطر نظر آتے ہیں۔ نہ جانے اس کی وجہ ذاتی تجربات ہیں یا کیا ہے۔ لیکن یہ تلخی ان کے ہاں کم ہے۔ ان کا مزاح مجموعی طور پر رمز وکنایہ، شگفتگی اور بذلہ سنجی لیے ہوئے ہے۔ ان کے مزاح کا نمایاں ترین وصف طنز ہے جو براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ (indirect) ہے۔ وہ رمز (irony) اور کم بیانی (understatement) کا استعمال بھی بڑی چابک دستی سے کرتے ہیں۔

آزاد کے مزاح پر کہیں کہیں جعفر زٹلی اور رنگین کا اثر ہے۔ زٹلی اور رنگین ہی کی طرح انھوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ پہلے سوال کے طور پر کوئی واقعہ سناتے ہیں پھر اس کے جواب میں یا تبصرے کے طور پر کوئی کہاوت یا شعر دے دیا ہے۔ جیسا کہ ''وقائع دربارِ معلیٰ اور ''اخبارِ رنگین'' میں ہے۔ ''روئدادِ اجلاسِ جنجال کونسل'' (۱۲۱) میں یہ سلسلہ موجود ہے لیکن زیادہ طویل نہیں ہے۔ چند ایک سوالات کے بعد جوابات کا یہ انداز برقرار نہیں رہتا۔ ان کے ایک مضمون ''بادشاہ نسب

امراض'' (۱۴۲) میں طبّی کتب اور امراض کے ناموں کی تحریف کی گئی ہے اور اسے پڑھ کر جعفر زٹلی اور حاتم کے مزاحیہ طبّی نسخے یاد آتے ہیں۔ آزاد پر فارسی مزاح کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ عبید زاکانی (۱۴۳) (م: ۷۱۔۱۳۷۰ء) کی تعریفات جو ان کے رسالے میں ہیں، ان سے بھی آزاد متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تعریفات جعفر زٹلی کی کلیات میں بھی موجود ہیں۔ (۱۴۴) (اس قسم کی بعض تحریریں اردو اور فارسی میں ''ال نامہ'' کے نام سے بھی موجود ہیں) آزاد نے اپنی جو مختلف قسم کی ''ڈکشنریاں'' لکھی ہیں کچھ عجب نہیں کہ ان کا مرکزی خیال انھی سے ماخوذ ہو۔

نواب سید محمد آزاد کا موضوع چوں کہ بنیادی طور پر سیاسی، سماجی اور تہذیبی ہے لہٰذا ان کا مزاح اس دور کے حالات، رجحانات، عام مباحث اور اس تہذیبی پیکار کا عکاس ہے جو اس دور میں جاری تھی۔ آزاد چوں کہ ''اودھ پنچ'' کے حلقے میں شامل تھے جس نے انگریزی تہذیب کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے کام کو مشن سمجھ کر شروع کیا تھا لہٰذا ان کے مزاح کا ایک بڑا حصہ اور زیادہ زور اسی سلسلے میں صرف ہوا ہے۔

آزاد نے اہلِ مغرب کی اخلاق باختگی، بے راہ روی اور ان خامیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جن کا تعلق اخلاق اور شرم و حیا سے تھا۔ اہلِ مشرق کی جن برائیوں کی انھوں نے بالخصوص نشاں دہی کی ان میں صفائی اور پاکیزگی کا خیال نہ رکھنا، پیری مریدی، کاہلی، اور نااتفاقی، کے علاوہ امرا و رؤسا کی غفلت اور حماقت اور ان کے درباریوں کی خوشامد اور مکاریاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آزاد نے اس دور کی ملکی اور غیر ملکی سیاست پر بھی اظہار خیال کیا اور مسائل و مباحث کی باریکیوں کو بیان کیا۔

لندن سے لکھے گئے خطوط میں وہاں کے ماحول، سماجی تصورات اور اقدار کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ ان میں جگہ جگہ رمز (irony) کے پردے میں مغربی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔ ان خطوط میں اور بعض دیگر مضامین میں بظاہر مغرب کو اچھا کہا گیا ہے لیکن درحقیقت چُن چُن کر ایسی مثالیں اور وضاحتیں پیش کی ہیں کہ مغربی تہذیب کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ خطوط لندن بہ غرضِ تحصیلِ علم جانے والے ایک صاحبزادے کی طرف سے ہیں اور ان میں والدہ، بیوی، دوستوں اور مولانا اودھ پنچ سے خطاب ہے۔ آزاد دکھاتے ہیں کہ کس طرح قیامِ لندن

امراض'' (۱۴۲) میں طبّی کتب اور امراض کے ناموں کی تحریف کی گئی ہے اور اسے پڑھ کر جعفر زٹلی اور حاتم کے مزاحیہ طبّی نسخے یاد آتے ہیں۔ آزاد پر فارسی مزاح کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ عبید زاکانی (۱۴۳) (م: ۱۷-۱۳۷۰ء) کی تعریفات جو ان کے رسالے میں ہیں، ان سے بھی آزاد متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تعریفات جعفر زٹلی کی کلیات میں بھی موجود ہیں۔ (۱۴۴) (اس قسم کی بعض تحریریں اردو اور فارسی میں ''ال نامہ'' کے نام سے بھی موجود ہیں) آزاد نے اپنی جو مختلف قسم کی ''ڈکشنریاں'' لکھی ہیں کچھ عجب نہیں کہ ان کا مرکزی خیال انھی سے ماخوذ ہو۔

نواب سید محمد آزاد کا موضوع چوں کہ بنیادی طور پر سیاسی، سماجی اور تہذیبی ہے لہٰذا ان کا مزاح اس دور کے حالات، رجحانات، عام مباحث اور اس تہذیبی پیکار کا عکاس ہے جو اس دور میں جاری تھی۔ آزاد چوں کہ ''اودھ پنچ'' کے حلقے میں شامل تھے جس نے انگریزی تہذیب کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے کام کو مشن سمجھ کر شروع کیا تھا لہٰذا ان کے مزاح کا ایک بڑا حصّہ اور زیادہ زور اسی سلسلے میں صرف ہوا ہے۔

آزاد نے اہلِ مغرب کی اخلاق باختگی، بے راہ روی اور ان خامیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جن کا تعلق اخلاق اور شرم و حیا سے تھا۔ اہلِ مشرق کی جن برائیوں کی انھوں نے بالخصوص نشاں دہی کی ان میں صفائی اور پاکیزگی کا خیال نہ رکھنا، پیری مریدی، کاہلی، اور نا اتفاقی، کے علاوہ امرا و رؤسا کی غفلت اور حماقت اور ان کے درباریوں کی خوشامد اور مکاریاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آزاد نے اس دور کی ملکی اور غیر ملکی سیاست پر بھی اظہار خیال کیا اور مسائل و مباحث کی باریکیوں کو بیان کیا۔

لندن سے لکھے گئے خطوط میں وہاں کے ماحول، سماجی تصورات اور اقدار کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ ان میں جگہ جگہ رمز (irony) کے پردے میں مغربی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔ ان خطوط میں اور بعض دیگر مضامین میں بظاہر مغرب کو اچھا کہا گیا ہے لیکن درحقیقت چُن چُن کر ایسی مثالیں اور وضاحتیں پیش کی ہیں کہ مغربی تہذیب کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ خطوط لندن بہ غرض تحصیلِ علم جانے والے ایک صاحبزادے کی طرف سے ہیں اور ان میں والد، بیوی، دوستوں اور مولانا اودھ پنچ سے خطاب ہے۔ آزاد دکھاتے ہیں کہ کس طرح قیامِ لندن

اور تہذیبِ مغربی کی رنگینیاں رفتہ رفتہ لندن جانے والوں پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں اور وہ نہ صرف آہستہ آہستہ وہاں اخلاقی برائیوں میں دھنستے جاتے ہیں بلکہ وہ ان برائیوں کا جواز بھی تلاش کرنے لگتے ہیں، اور انھیں وطن، اس کی ہر چیز اور ہر رسم و رواج زہر لگنے لگتے ہیں۔ یہ خط فرضی تھے لیکن اتنے بے ساختہ اور فطری ہیں کہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً لندن سے اپنی بیوی عفت بیگم (۱۲۵) کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا ہے روز بروز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔(۱۲۶)''

مزید لکھتے ہیں:

''واقعی اس سے بدنصیب دنیا میں کوئی نہیں جو اس مردم سوز خطۂ غیر مہذب ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔(۱۲۷)''

مغربی تہذیب میں عورتوں کی بے جا آزاد خیالی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار، رفتار اور ذہانت اور جودت سے بیس بیس جنٹلمنوں یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے۔(۱۲۸)''

ام الخبائث پر اس طرح رائے زنی کی:

''ایک بڑے شاعر کا مقولہ ہے کہ جو نہیں پیے گا وہ کبھی انگریزی لفظوں کو صحیح طور سے تلفظ نہیں کر سکے گا۔(۱۲۹)''

تعلیم نسواں پر انھوں نے اپنی ''نئی ڈکشنری'' میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بحث طلب اور اختلافی ہے لیکن بہر حال ان کی اور اس دور کے کئی لوگوں کی ذہنیت اور تعلیم نسواں پر ان کے خیالات کا مظہر ضرور ہے۔ لکھتے ہیں:

''فیمیل ایڈوکیشن (تعلیم نسواں): عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا، اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت کے لیے دوسرے کی میم سے مبادلہ کرنا، کمزور لڑکیوں کو تھوڑا تھوڑا پوٹ پلانا، مس بابا لوگوں کو ہوا کھلانا، کالی میموں کو انگریزوں کی ملاقات کے لیے جبرًا و قہرًا لے جانا اور اگر وہ وہاں جا کر شرمائیں تو جوشِ تہذیب سے گھونگٹ کھول دینا۔(۱۳۰)''

مشرقی تہذیب کی خامیوں میں انھوں نے امرا اور رؤسا کی غفلت، حماقت اور رفتارِ زمانہ سے عدم واقفیت کو بہ طور خاص موضوع بنایا ہے اور ایک ڈراما اسی موضوع پر تحریر کیا ہے۔ ''نوابی دربار'' (۱۳۱) نامی اس ڈرامے کے نواب، ان کے زنان خانے اور درباریوں کے رویے، سوچ اور حرکات و اعمال سے اس دور کی ریاستوں کے حکمرانوں کی زندگیوں اور کمزوریوں کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے اور یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ انگریزوں نے کس طرح ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دھیرے دھیرے ریاستوں کو ہڑپ کرنا شروع کیا اور اپنے تسلط کو وسعت اور قوت دیتے گئے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہی ہے کہ کس طرح امرا کے مصاحبین انھیں خوشامد سے بے وقوف بنا کر لوٹتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی ان امرا کو اپنے تفاخر اور آن بان کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔(۱۳۲) اور کس طرح اس مصنوعی شان وشوکت کی خاطر ریاستیں اور رجواڑے تباہ و برباد ہوتے رہے۔ طمانچے مار کر گال سرخ رکھنے کی اس پالیسی کو ''نوابی دربار'' میں نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

گو اس ڈرامے میں مزاحیہ مکالمے یا لفظی نوعیت کا مزاح بہت کم ہے، لیکن اس کا مجموعی تاثر طنزیہ ہے۔ پورے پلاٹ اور مرکزی خیال میں ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ اکثر مکالمے مصنّف کے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں اور مرکزی خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً نواب غفلۃ الدولہ کے مصاحبین میرزا خوشامد بیگ، میر زمانہ ساز اور لوٹ مار خاں جب ملی بھگت سے ایک نام نہاد مقدمے کا فیصلہ بہت سا روپیہ ہڑپ کرنے کے بعد نواب صاحب کے حق میں کروا دیتے ہیں، اس وقت مصاحبین کے مکالمے اس خوشامد کو واضح کرتے ہیں جو درباروں کا خاصا تھا، مثلاً:

''مرزا صاحب: حضور واللہ آج بے موسم عید ہے بلکہ نوروز ہے۔

میر صاحب: اے یہ کیا کہتے ہو۔ بیس عید کو آج کے دن پر سے نثار کرتا ہوں۔(۱۳۳)''

اس کے بعد مہاجن سے قرض لے کر اس ''کامیابی'' پر دھوم دھام سے رات بھر جشن منایا جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں انگریز عمال کی لوٹ کھسوٹ کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاسی مسائل، مغرب کی سماجی اقدار اور سیاسی معیاروں پر آزاد نے جابجا طنز کیے ہیں۔ خصوصاً ان کی مختلف لغات میں مغرب کی سیاست اور سیاسی خصوصیات، مفادات اور تضادات پر نہایت عمدہ طنزیہ اور مزاحیہ تبصرے ملتے ہیں۔ ان سب کا فرداً فرداً تذکرہ باعث طوالت ہوگا۔ صرف عنوانات سے اس کی وسعت اور موضوعات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: پولیسی (حکمت عملی)، انٹرسٹ (حقوق)، کورٹ شپ (عشق ازدواجی)، یورپین کنسرٹ، پارلیمنٹ، اولڈ پاپا، الکشن زادہ، کون شینس، تھینکس، پارٹی فیلنگ، آنر، سویلیزیشن، سائنٹفک فرنٹیئر وغیرہ۔(۱۳۴)

آزاد کے دور میں برعظیم اور عالمی سیاست کی بساط پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں آزاد کی نہ صرف ان پر نظر تھی بلکہ انھوں نے اسے موضوع بھی بنایا اور ان پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرے کیے۔ روس اور مالٹا کی لڑائی، سرسید کی نیچریت، وہابی عقیدے کا پھیلاؤ، ترکی کے سلطان اور اس کی سلطنت کی بقا کا سوال، یورپی سلطنتوں کا مفاد پرستانہ اتحاد، برطانوی وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کی وزارت عظمیٰ سے معزولی، مقامی نوجوانوں کا ولایت جانے کا بے جا شوق، جنگِ افیون (۱۳۵) اہل برعظیم کی افیم خوری اور غلیظ عادات، حاجیوں کی جوتم پیزار، انگریزوں کی آلوخوری کی عادت، ترکی ٹوپی کا استعمال، چھری کانٹے سے کھانا، غرض اس دور کے بے شمار چھوٹے بڑے تہذیبی، سماجی اور سیاسی مسائل پر انھوں نے رائے زنی کی ہے۔

اس وقت کی ملکی اور غیر ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ اور ترکی کے مسلمانوں اور خلافت سے مقامی مسلمانوں کی دلچسپی اور ہمدردی کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ”... مسٹر گلیڈ اسٹون کی حالتِ صحت بہت نازک اور مخدوش ہو رہی ہے... سرسامی حالت میں بعض اوقات مبتلا ہوکر زیرلب سلطان کی نسبت کچھ لعن طعن اور گریس کے حق میں دعا کر لیتے ہیں، اور وزارت سے اپنی معزولی پر اکثر آہ سرد بھرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اس مرض کو بلکیرین ہذیان بتایا ہے اور مذہبی جوش، انسانی ہمدردی اور مسلمانوں کی فطرتی عداوت کو اس کی اصل وجہ کہتے ہیں۔(۱۳۶)“

دراصل گلیڈ اسٹون نے برطانوی وزیراعظم ڈزرائیلی (Benjamin Disraeli) (۱۸۰۴ء ۔ ۱۸۸۱ء) ۔(۱۳۷) کے دور اقتدار ۸۰۔۱۸۷۴ء میں ڈزرائیلی کی ترک حامی پالیسی کی سخت مزاحمت کی تھی۔ نیز بلغاریہ کے ۱۸۷۶ء کے انقلاب کے نتیجے میں ہونے والی روس ترک جنگ (۱۸۷۷ـ۷۸) بھی ان دونوں رہنماؤں کے درمیان مشہور سیاسی زور آزمائی ہوئی۔ گلیڈ اسٹون ترکی کے مخالفین میں سے تھے اور برعظیم کے مسلمان مذہب کی بنیاد پر ترک مسلمان اور خلافت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ آزاد کا گلیڈ اسٹون پر طنز قرین قیاس ہے۔ بلغاریہ ہی کی مناسبت سے انھوں نے ''ہلکیرین ہذیان'' کا ذکر کیا ہے۔

''سوانح عمری مولانا آزاد'' نواب سید محمد آزاد کی فرضی سوانح عمری ہے۔ اس پُر لطف اور مزاحیہ سوانح عمری میں نواب سید محمد آزاد نے اپنی زندگی کے فرضی واقعات بیان کیے ہیں اور مغرب زدگی، آزادیٔ نسواں، مکر وفریب اور سید احمد خاں پر گہرے طنز کیے ہیں۔ سوانح عمری کے پردے میں انھوں نے سید احمد خاں کے علاوہ نام نہاد ''رفارمروں'' پیروں، مولویوں، وکیلوں اور سیاست دانوں وغیرہ کے لتے لیے ہیں۔ سوانح عمری کی ابتدا اتنی سنجیدہ ہے کہ لگتا ہے نواب آزاد اپنی زندگی کے سچ سچ حالات اور واقعات بیان کرنے جا رہے ہیں۔

اس سوانح عمری میں سید احمد خاں اور ان کے معتقدوں پر کھلم کھلا چوٹ کی گئی ہے:

> ''اردو میں ہم سید مغربی کی عبارت اور تصانیف کی بے انتہا تعریف کرتے تھے اور اون کو بلا خیال اس کے کہ کوئی نسبت مشبہ اور مشبہ بہ میں ہو یا نہو، بائرن، مکالے، ہملٹن [غالباً ملٹن] سروالٹر سکاٹ، گولڈسمتھ غرض جس انگریز سے جی چاہتا ملا دیتے تھے اور اس پر حاضرین جلسہ بغیر اس علم کے کہ یہ سارے انگریز مصنف ومحرر تھے یا جنگلی جانور بلا تامل صاد کر دیتے تھے۔(۱۳۸)''

اس سوانح عمری میں دراصل نواب آزاد نے اپنے زمانے کے حالات اور بدلتی ہوئی اقدار پر طنز کیا ہے کہ:

''موجودہ زمانے کے تمدن اور قواعد ناموری کے مطابق کوئی ٹیک ریٹ،

ایمان دار اور سچا آدمی بڑا شخص نہیں بن سکتا اور دنیا میں اوس [اس] کو
معصوم رہ کر ہر طرح کا عیش و آرام کبھی نصیب نہیں ہوسکتا۔(۱۳۹)''

تعجب ہوتا ہے کہ آزاد کے ان خیالات سے ہم موجودہ دور کے لوگ بھی اتفاق کریں گے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آزاد نے اس سوانح عمری میں نیکی، ایمان داری، سچائی اور معصومیت کو ترک کر کے بڑا آدمی بننے والے کا برا انجام اور بالآخر اسے جیل کی ہوا کھاتے دکھایا ہے۔(۱۴۰)

نواب سید محمد آزاد کے بارے میں مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اپنے دور کے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو موضوع بنانے کے لیے انھوں نے طنز کو کامیابی سے برتا۔ رمز (irony) اور کم بیانی (understatement) کے چابک دست استعمال نے انھیں ایک کامیاب مزاح نگار بنادیا ہے۔ نواب سید محمد آزاد کا درجہ نہ صرف ''اودھ پنچ'' کے مزاح نگاروں میں بلکہ انیسویں صدی کے مزاح نگاروں میں بہت بلند ہے۔

مچھو بیگ ستم ظریف (۱۸۳۱ء۔۱۸۹۴ء)

منشی سجاد حسین اور نواب سید محمد آزاد کے بعد مرزا محمد مرتضیٰ مچھو بیگ ستم ظریف (۱۴۱) ''اودھ پنچ'' کے نمایاں ترین لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اگرچہ اکبرؔ الہٰ آبادی بڑا نام ہے لیکن ستم ظریف نے ''اودھ پنچ'' میں اکبر کے مقابلے میں کہیں زیادہ لکھا ہے۔(۱۴۲)

ان کے ''اودھ پنچ'' میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ ''چشمۂ بصیرت'' کے عنوان سے مولوی حکیم الدین نے مرتب کیا تھا۔(۱۴۳) لیکن اس کے مجموعۂ مضامین ہونے کی تردید کی گئی ہے۔(۱۴۴) اصطلاحات و محاورات کی لغت ''بہارِ ہند'' (۱۸۸۹ء) کے عنوان سے چار حصوں میں تصنیف کر رہے تھے لیکن اس کا ایک ہی حصّہ شائع ہوسکا۔(۱۴۵)

ستم ظریف مزاح پیدا کرنے کے لیے بالعموم لکھنؤ کے مخصوص محاورے اور بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اکثر مضامین میں غیر ضروری طول طویل بیانات اور مکالمات ہیں۔ ان میں مزاح کم ہے اور طولانی باتوں میں مطلب خبط ہوجاتا ہے۔ چھلکے اتارتے جایے گودا ندارد۔ کہیں کہیں محض محاورہ بندی ہی مقصد نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں مزاح منشی سجاد حسین اور

نواب سید محمد آزاد کے مقابلے میں کم ہے اور طنز اس سے بھی کم۔

ستم ظریف نے لکھنؤ کے حالات اور ماحول کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ لکھنؤ کی عورتوں، نوابوں، وکیلوں اور گواہوں کے حالات اور ان کی مخصوص زبان مضامین میں خاص طور پر جھلکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ علی گڑھ سے اختلاف رکھتے تھے۔

ان کے مضامین کا عنوان اکثر شعر یا مصرع کی صورت میں ہوتا تھا بلکہ چار مصرع بھی بطور عنوان دیے اور کبھی کبھی مضمون میں بھی قافیہ پیمائی ہوتی تھی مثلاً ایک مضمون افلاس کا حال بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے:

افلاس کے ہاتھوں سے ہے خالی تنگ و دو روز
سب کہتے ہیں نو روز ہے نو روز ہے نو روز (۱۴۶)

(رمضان، نوروز، عید، نیا سال، محرم اور اسی قسم کے دیگر تہواروں پر ''اودھ پنچ'' میں خصوصی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔) اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''نکاح بہتیرے مگر شادیاں کم، بارش کا معاملہ وہی گھم گھم،... دن کو دھوپ رات کو تارے نظر آئیں، گرمی کے رمضان شریف پانی خوب پلوائیں... نماز کے وقت سویرا ہو چراغ تلے اندھیرا ہو۔ مسلمانوں میں افلاس ہو، روپیہ پیسا بنیوں کے پاس ہو... کالجوں میں چوہے ڈنڈ پیلیں طالب علم تالیاں بجائیں، گلی ڈنڈا کھیلیں۔(۱۴۷)''

اس مضمون میں زیادہ زور محاورے باندھنے اور قافیہ پیمائی پر ہے۔ تاہم اس دور کے حالات کی جھلک اس میں ضرور موجود ہے۔ ستم ظریف کا طنز اکثر براہِ راست ہوتا ہے اور طوالت کی بنا پر لطف کھو دیتا ہے۔ جیسے استاد شاگرد کی اس گفتگو میں:

''یہ کہو مدتوں میں جو ہم نے اپنا دماغ کھوکھلا کر کے تمھیں آدمی بنایا تھا وہ سبق تو نہیں بھلا دیے؟''

''توبہ جناب... آپ کے پڑھائے ہوئے سبق تو اس طرح یاد ہیں جیسے کوے کو سرگمیں، رنڈیں کو چونگے، وکیلوں کو قانون، عملہ والوں کو

رشوت، پولیس کو جھوٹی کارروائی، عبدالرحمان خان کو روسیوں کے احسانات، لکھنؤ والوں کو چانڈو خانہ، برقندازوں کو کبیر، کاشت کاروں کو خشک سالی، نمبرداروں کو مئی جون کی قسط، بنیا اخبار کو خوشامد، نیچریوں کو مختار الملک کا زمانہ۔(۱۴۸)''

اس اقتباس میں لکھنؤ اور اس کے گرد ونواح کے سماج اور تہذیب کے بارے میں بہت سے حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ اکثر تو ظاہر ہیں جیسے رنڈیوں کو چونگے (بمعنی خوشامد) عملہ والوں کو رشوت وغیرہ۔ البتہ ایک آدھ کی وضاحت ضروری ہے مثلاً برقندازوں کو کبیر۔ کبیر دراصل وہ فحش گیت ہوتے تھے جو ہولی کے موقع پر پوربی ہندو گایا کرتے تھے۔ اسی طرح ''بنیا اخبار'' کا خطاب ''اودھ پنچ'' نے ''اودھ اخبار'' کو دے رکھا تھا۔ یہاں اس کی پالیسی پر طنز ہے۔

''جولاہا کانفرنس'' نامی ایک مضمون میں یوپی کے دیہات کے لہجے کی نقل کی ہے اور علاقائی اردو کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ سماجی اور معاشی مسائل پر روشنی ڈالی ہے:

''اے بھائیو آپ لوگن کھوب جانت ہیں کہ ہندوستان میں میجر (منچسٹر) کے کپڑے اور کسم کسم کے انگریجی لوگے کی تجارت نے ہمرے پیسہ میں کیسی نکصان پہنچائی ہے۔ ہمری آمدنی ہمری روجی اور ہمری ترکی میں کیسی کچھ کمی اور جرر رسائی کا سبب بھئی ہے۔(۱۴۹)''

اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۵ء۔۱۹۲۱ء)

اکبر حسین الٰہ آبادی (۱۵۰) پر اگرچہ بہت کام ہوا ہے لیکن زیادہ تر ان کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبر کی نثر نگاری بھی اس قابل ہے کہ اس پر بھرپور توجہ دی جائے۔ ''اودھ پنچ'' کے اجرا کے وقت سے نثر لکھنی شروع کی اور لگ بھگ ۱۹۰۴ء تک لکھتے رہے۔(۱۵۱) ان کی نثر میں تراجم سے قطع نظر متعدد مضامین اور خطوط شامل ہیں۔

''اودھ پنچ'' میں اکبر کے مضامین ا۔ح کے نام سے شائع ہوئے جو اکبر حسین کا مخفف ہے۔ اکبر کا نثری اسلوب ''اودھ پنچ'' کے دیگر لکھنے والوں سے بڑا ملتا جلتا ہے۔(۱۵۲) ان

کے موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں۔ اکبر کے ہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لیے وہ بالعموم لفظی رعایتوں اور مناسبتوں سے کام لیتے ہیں۔ اکبر کے ہاں ''اودھ پنچ'' کے مزاح کی مخصوص خامی یعنی مزاح کی وضاحت، خلط مبحث اور غیر ضروری طوالت موجود ہے۔

علی گڑھ، سید احمد خاں اور نئی تہذیب کے کٹر مخالف تھے۔ ذیل میں ان کے مزاح کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔ اس میں انھوں نے سید احمد خاں کی انگریز دوستی اور مذہبی عقائد پر طنز کیا ہے۔

> ''سید احمد خاں دوسرے خیال کا کہن سال انسان ہے۔ وہ نیچر سے کہتا ہے کہ اے نیچر مرحبا تجھ پر اور تیری ہفتاد پشت پر کہ تو نے ایسی قوم کو پیدا کیا جیسے انگریز ہیں۔ ہم کو ایسے گورے چٹے خوب صورت بالا بلند عالی حوصلہ جفاکش دلیر غیور دانش مند حکیم مزاج حکام کہاں ملیں گے۔ ہم کو مذہب کی قید سے آزاد کون رکھے گا۔ ہم کو دوزخ کے جھوٹے دھڑکوں سے کون نجات دے گا۔ (۱۵۳) ہم کو اچھی اچھی نوکریاں کون دے گا۔ ہم میں ایسی باریکی سے کون انصاف کرے گا۔ اے نیچر! ان انگریزوں میں جو رہی سہی ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ (للہ اختصار مدنظر رکھیے) برائیاں ہیں ان کو بھی دُور کر دے اور تا قیامِ دہران کو ہمارے سر پر سایہ فگن رکھ اور ہم لوگ یکدل ہو کر ہل مل پنیاں کو جائے ری نندیا گایا کریں۔ (۱۵۴)''

تربھون ناتھ ہجر (۱۸۵۳ء۔۱۸۹۲ء)

بقول منشی سجاد حسین ''اودھ پنچ'' کے پہلے خریدار تربھون ناتھ ہجر (۱۵۵) ہی تھے اور سال بھر تک لگ بھگ ہر پرچے میں آپ کے ایک دو مضامین چھپتے رہے۔ (۱۵۶) ان کا مزاح ''اودھ پنچ'' کا مخصوص انداز لیے ہوئے ہے۔ مثلاً:

محرم الحرام

''آپ کا سونا نہ ٹھہرا ہمارا نصیب ٹھہرا کہ ایک مرتبہ جو لمبی تان کے اٹھا
غفیل ہوتا ہے تو بس گھوڑے ہی بیچ کے سویا... ہاں یہ تو فرمائیے کیوں کر
آئے نہ سان نہ گمان کھٹ سے موجود۔ اے حضت یہ نہ پوچھیے۔ آئیے
اس طرح آئیے جیسے سمندر میں جوار بھاٹا، زمین میں زلزلہ، ہندوستان
میں ادبار، مدارس میں قحط، سلطنتِ عثمانیہ میں زوال، کابل میں روسیوں کی
سفارت، دیسی اخبارات میں اکٹ نو،... چشمِ بد دور آپ کی آمد آمد نہ
ہوئی قیامت ہوئی مرگِ مفاجات ہوئی۔(۱۵۷)''

جوالا پرشاد برق (۱۸۶۳ء۔۱۹۱۱ء)

برق (۱۵۸) کے ہاں مزاح بہت کم ہے۔ سنجیدہ تنقید سے زیادہ کام لیا ہے۔ محاورے اور لکھنؤ کی مخصوص زبان کے استعمال کے شائق ہیں۔ اسلوب ''اودھ پنچ'' کے دیگر لکھنے والوں کا سا ہے۔ ذیل کا مضمون انھوں نے ''اودھ پنچ'' میں لکھا تھا۔ اس وقت حکومت نے بنیوں کے کم تولنے کے خلاف قانون نافذ کیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہیں:

''ذرا ڈنڈی ترازو سنبھال کے''

''ڈیئر پنچ بنیے کی گون میں نوسن کے دھوکے کا حال اب کھلے گا۔
گورنمنٹ نے دیکھا کہ بنیے سیدھے نہیں ہوتے۔ بٹے مختلف وزن
مختلف۔ جب کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنسا، ترازو کے چکر میں
ڈال کے ٹکے اینٹھ لیے... ہماری گورنمنٹ بھی بنیوں کی گرو گھنٹال نکلی...
بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ شہر کے ایک حصّے کا وزن کچھ اور دوسرے کا
کچھ۔ بھئی سنو... مانا قانون جاری ہوگیا۔ بٹے ترازو ٹھیک ہوگئے۔ مگر
ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ پولیس کو نئے نئے موقع ہتھے مارنے کے ملیں گے۔

ان کی کون روک ہے؟... تو یہ کہیے کہ یک نہ شد دو شد کا معاملہ ہوا۔
ابھی تو بنیے ہی تھے۔ اب پولیس کا اڑنگا نیا ہوا۔(۱۵۹)''

جوالا پرشاد برق نے ترجموں پر کافی وقت صرف کیا۔(۱۶۰) غالباً اسی لیے مزاح کے ضمن میں ان کی کوئی علاحدہ تصنیف موجود نہیں۔

منشی احمد علی شوق قدوائی (۱۸۵۲ء۔۱۹۲۵ء)

احمد علی شوق (۱۶۱) کا مزاج علمی زیادہ تھا۔ رام پور میں علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ اخبار نکالا۔ زیادہ تر سنجیدہ اور علمی مضامین لکھے۔ ''اودھ پنچ'' میں بھی لکھا۔ ڈراما نویسی کا بھی شوق تھا اور ''قاسم وزہرا'' کے نام سے ایک ڈراما بھی لکھا۔ چوں کہ طبعاً مزاح کی طرف مائل نہ تھے اور زبردستی مزاح لکھا اس لیے ان کے مزاح میں وہ توانائی نہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح بہت کم ہے اور تکلفاً ہی ان کو مزاح نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ البتہ ''اودھ پنچ'' کے حوالے سے اور تحریر میں ہلکی سی شگفتگی کی وجہ سے ان کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ''اودھ پنچ'' کی مخصوص روش میں مزاح لکھنے کی کوشش کی۔ محاورہ بندی پر زور رہا اور اودھ کی معاشرت کو موضوع بنایا۔ زبان کے چٹخارے، رعایت لفظی اور محاورہ بندی کا شوق تحریر سے عیاں ہے۔ مثلاً ''یہ تماشا دیکھیے'' کے زیرِعنوان شب برات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ جلمونہی شبرات ایسی مہنگی میں اور جلے کو جلانے آئی... آتش بازی و آتش بازی تو خاک نہیں۔ جی سنبھالنے کو گردش کا چکر، دورانِ سر کی چرخی، داغِ جگر کی مہتاب، آہِ آتش فشاں کی ہوائی، ٹپ ٹپ ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی پھلجڑی، ہچکیوں کے پڑاتے موجود ہیں۔ رہا حلوا۔ سو یہاں فاقوں نے یونہی حلوا نکال رکھا ہے۔(۱۶۲)''

''اودھ پنچ'' کے غیر معروف لکھنے والے

جنوری ۱۸۷۷ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک لگ بھگ چھتیس سال کے عرصے میں ''اودھ پنچ''

کے تقریباً اٹھارہ سو شمارے نکلے اور ان میں بے شمار لوگوں نے لکھا۔ ان میں کچھ مستقل لکھنے والے تھے جنھوں نے سالوں تک مسلسل قلمی معاونت کی اور کچھ وقتی طور پر ''اودھ پنچ'' کے ساتھ چلے، دو چار ہی مضامین لکھے۔ کسی نے ''اودھ پنچ'' کی مقبولیت اور عوام کے مزاح کی طرف رجحان کو دیکھ کر لکھا اور کچھ طبعاً ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ''اودھ پنچ'' کے نامور اور حیاتِ جاوداں پانے والے قلم کاروں کے علاوہ بھی اس کے صفحات میں ایسے بے شمار لوگوں کی فکری کاوشیں بکھری پڑی ہیں جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا لیکن اپنے دور میں انھوں نے خوب لکھا اور جو اپنے عہد کے ترجمان بھی تھے۔

''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں کی اس گمنامی میں کچھ تو مرورِ ایام اور قسمت کو دخل ہے اور کچھ خود ان کی اس بے نیازی اور پردہ داری کو جس کے تحت انھوں نے فرضی اور قلمی ناموں سے لکھا۔ کچھ نے تو کئی نام اور مخفف رکھے تھے۔ ان میں ایڈیٹر ''اودھ پنچ'' منشی سجاد حسین سرفہرست ہیں جو نام بدل بدل کر لکھتے تھے۔ آج ''اودھ پنچ'' کے پرانے فائل دیکھنے والا اس الجھن میں ضرور مبتلا ہوتا ہے کہ کون سا فرضی نام اور مخفف کس لکھنے والے کا ہے۔ دیگر لوگوں کے بارے میں بھی (جن میں سے کئی نے اچھی خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں) یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنے مکمل نام کے ساتھ مستقلاً لکھا ہے ان کا بھی کوئی اتا پتا، کوئی نشان یا تاریخِ ادب میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ جو لوگ ایسے ناموں کی حقیقت اور فرضی ناموں سے لکھنے والوں کی اصلیت سے ممکنہ طور پر واقف رہے ہوں گے انھوں نے بھی کبھی اس طرف اشارہ نہیں کیا اور آج جب کہ ''اودھ پنچ'' کے اجرا کو لگ بھگ سوا صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس کے پہلے دور کے آخری شمارے کو منظرِ عام پر آئے بھی تقریباً پون صدی گزر چکی ہے، ان ناموں اور شخصیات پر سے پردہ اٹھانا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے۔

نثار احمد فاروقی نے ایک ایسے ہی لکھنے والے کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ مولوی عبدالغفور شہباز کے شاگرد سید فضل ستار نقوی لاابالی ''اودھ پنچ' میں لاابالی، لاغر، مولانا دکنی، مولانا جنوبی، مس چشتیہ اور مس سہروردیہ وغیرہ کے فرضی ناموں سے نظم و نثر لکھا کرتے تھے اور خود منشی سجاد حسین بھی اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ ان ناموں سے کون لکھتا ہے۔ (۱۶۳)

''اودھ پنچ'' کے نامور لکھنے والوں نے بھی اکثر اس پردہ داری سے کام لیا ہے مثلاً اکبرالہ آبادی۔ ا۔ح کے نام سے لکھتے تھے۔ جوالا پرشاد برق ج۔ پ۔ برق کے نام سے لکھتے تھے۔ نواب سید محمد آزاد نے اکثر وبیش تر صرف آزاد لکھنے پر اکتفا کی۔ تربھون ناتھ ہجر نے ت۔ ھ کے نام سے لکھا۔ احمد علی کسمنڈوی نے ا۔ع کسمنڈوی کا مخفف اختیار کیا۔ مچھو بیگ ستم ظریف نے صرف ستم ظریف کے نام کو کافی سمجھا بلکہ بعض مضامین تو شوخ ظریف (۱۶۴) اور شوخ ظریف شیدا (۱۶۵) کے نام سے بھی ملتے ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ ستم ظریف ہی کے قلم سے نکلے تھے۔

چھوٹے چھوٹے نام اور مخفف تو ''اودھ پنچ'' میں عام تھے۔ مثلاً ایم۔ ایم، مسٹر آر، فلک سیر، ہندی (۱۶۶)، ناظرف دار، ہم فراق، متفکر، فیثاغورث، دماغ فتح پوری، بہانۂ بسیار، باڈی گارڈ، مسلمان، روشن خیال، م۔ح از بنارس، ع۔ راز گڈھوال، مقفنن، س۔م۔ ہ۔ از سلطان پور، م۔ت۔ ح سحر طراز مونگیری، ح۔ م۔ ن اور ز۔ ر۔ ف قسم کے بے شمار نام اکثر و بیش تر نظر آتے ہیں۔ راقم کی جگہ اردو یا فارسی کا کوئی مصرعہ لکھ دینا عام سی بات تھی مثلاً ''کسی بشنود یا نشنود من گفتگوئی می کنم (۱۶۷)'' لکھ دیا۔ بلکہ ایک مضمون میں تو بے نیازی کی حد ہوگئی اور ''راقم: کوئی ہوگا'' کو کافی سمجھا گیا۔

چوں کہ ان تمام تحریروں کا نمونہ دینا اور ان کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں لہٰذا ان میں سے چند منتخب تحریروں کے اقتباس دیے جا رہے ہیں:

ج ب فروغ:

ج ب فروغ کے کچھ مضامین ۱۸۸۳ء کے فائل میں ملتے ہیں۔ مثلاً ۳۰ جنوری، ۲۰ فروری، ۶ مارچ اور ۸ مئی کے شماروں میں ان کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کے ہاں مزاح بہت کم ہے۔ زمانے کے تغیرات کو ایک جگہ موضوع بنا کر لکھتے ہیں:

> ''پشتوں کے امیر صاحب کی حکومت یوں تباہ ہوئی کہ دانہ دانہ کو محتاج ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور ان کی قائم مقامی میں وہ کندہ ناتراش گمنام اجہل جن کی نسل میں حضرت آدم سے لے کر والد ماجد تک

سوا وے ہل جوتنے کو دون پھانکنے کے کسی نے زمینداری کا نام بھی نہ سنا
تھا تعلق دار جاگیردار بن بیٹھے۔(۱۶۸)''

ش چ لاہوری:

۱۸۸۳ء کے فائل میں ان کے بھی کچھ مضامین ملتے ہیں۔ اکثر ایک شمارے میں دو دو تین تین مضامین یا شذرات لکھے ہیں۔ مثلاً ۹ جنوری، ۱۶ جنوری، ۱۳ مارچ اور ۱۷ جولائی کے شماروں میں ان کے مضامین موجود ہیں۔ ان کے ہاں مزاح ج ب فروغ کی نسبت زیادہ ہے بلکہ دیگر نامور لکھنے والوں کے ساتھ ان کا نام بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۸۸۳ء کے پرچے میں ''کل کل کل کل'' کے عنوان سے ایک اچھا مضمون انھوں نے لکھا ہے، جس میں انسان (بالخصوص امیر زادوں) کی کاہلی اور کام کو کل پر ٹالنے کی عادت کو عمدگی سے واضح کیا ہے۔ اکثر لاہور کے مقامی مسائل مثلاً صفائی کا فقدان وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں ان کے زمانے کے شدت سے زیر بحث موضوع ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' کو لفظی الٹ پھیر کے ذریعے تفنن کا سبب بنایا ہے:

''لو! کل سلف گورنمنٹ''

''خدا اس رپن لاٹ (۱۶۹) کو صد وی سال عمر عطا کرے۔ ایسا سیر چشم تو انگریزوں کی کل قوم میں چراغ لمپ کیا برقی روشنی لے کر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔''

''کیوں حضرت سیر چشمی کی دلیل؟''

''اجی میاں بھلا اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اپنی قومی حکومت تک کو ہندوستان کی آزادی پر قربان کردیا۔ اور صاف صاف ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ لو! کل سلف گورنمنٹ (اپنے گزشتہ زمانے کی حکومت) کو کل لے لو۔ بس اب کل سے پھر وہی ہندوستان اور وہی ہماری سلف یعنی گزشتہ زمانے کی حکومت۔(۱۷۰)''

م ع حضرت ہوش لکھنوی: کے نام سے بھی لکھا۔(۱۷۱) محاورہ بندی پر زیادہ توجہ

رہی۔ سید احمد خاں کے انگریزوں کے کلچر کو اپنانے پر لکھا:

''... جب سے اس جھل جھل دار ٹوپی اور بڑی مہری کا گھٹنا اور چار جیبوں بڑے بڑے بوتاموں کا کرتا پہنا اچھا خاصا ولایتوں [ولایتیوں] کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر رنگ روپ نہ بدل سکا خالی خولی بہروپ ہی بدلا ہے۔ سرتا سرا انھیں کی تقلید... چھری کانٹے سے کھانا کھانا۔ اناج کو ہاتھ نہ لگانا۔ کھڑے ہوکر موتنا۔ کاغذ سے آبدست کرنا۔ ہر ایک بات میں انھیں کی پچ۔ ہر ذکر میں انھیں کی طرف داری۔ وہ لوگ ایسے اور وہ لوگ ویسے۔ جدت پسند، مہذب، عقل مند، تعلیم یافتہ، خاک سے روپیہ پیدا کریں۔ انتہا کے مستقل مزاج۔ بلا کے صاحبِ وقر۔ کمال صابر۔ صفائی کے حاکم۔ بلا کے انسان۔ چنیں اور چناں۔ غرض جو وہ کرسکتے ہیں کسی سے نہیں ہوسکتا۔ یا میرے خدا ایسا بڑھایا کہ جھنڈے پر چڑھایا۔(۱۷۲)''

''مینڈک کانفرنس'' کے عنوان سے ایک مضمون جلسوں اور چندوں کے خلاف چھپا تھا۔(۱۷۳) اس میں راقم کا نام ''ناآشنا از دریا آباد بقلم م ع ح'' دیا ہے۔

س م ہ از سلطان پور:

ان کے ایک مضمون میں اردو شاعری کی بھد اڑائی گئی ہے۔ اس کا اقتباس:

''بھئی واللہ بعضے وقت جی چاہتا ہے ان شاعروں کا منھ نوچ لوں۔ کیا کیا اپچ کی لیتے ہیں کہ واہی واہ۔ معشوق کی تعریف میں وہ وہ زٹل قافیے اڑائے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ لیجیے صاحب کمر ندارد دہن بھی غائب غلہ۔ رخِ پُرنور شعلۂ طور۔ گال جلتے بلتے انگارے۔ بالوں کی جگہ بڑے بڑے کالے سانپ... دل لگی تو جب ہو کہ شاعر صاحب کے پاس خواب میں کبھی ان کے معشوقِ خیالی بہیئت کذائی جلوہ فرما ہوں۔ خدا جانے ساری شاعری لحاف میں خطا ہوجائے۔(۱۷۴)''

قیصر:

ان صاحب کے بھی خاصے مضامین ۱۸۸۳ء کے فائل میں ہیں۔ ایک مضمون میں اس دور کے نہایت اہم تہذیبی اور علمی مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مسئلہ اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا تھا۔ یہاں وہ انگریزوں سے خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دو نشد تین شد"

"لیجیے حضرات وہ ہندی اردو کا جھگڑا تو تھا ہی یہ ایک رومن اردو اور پیدا ہوئیں۔ اس کے ممبروں کی اور بھی نئی ہانک ہے۔ حروف انگریزی عبارت اردو... ہاں اے اردو ہندی کے تائید کرنے والو، ذری ہوشیار ہو جاؤ اور کان پھٹپھٹا ڈالو... تمھاری تھی متی تلی اور یہاں وہ یورپین ڈگ... (۱۷۵)"

دراصل اردو رومن کمیٹی کا سیکرٹری ڈک نامی کوئی انگریز تھا۔ اس کو ڈک سے ڈاگ (Dog) بنا دیا۔ غالباً تلی کی رعایت سے۔ رومن اردو کی جو بحث بعد میں اٹھتی رہی وہ نئی نہیں تھی اور اردو والوں کا نقطۂ نظر بھی کم و بیش وہی رہا۔

ابراہیم:

ان کے ایک مضمون "رنگ لادیں گے ہمارے کوٹ پتلون ایک دن" سے اقتباس، جس میں ان کا انداز براہِ راست تلقین کا سا ہے:

"کیا وجہ ہے کہ آپ کی جہالت ہم کو اس لباس میں عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی... کوٹ پتلون نہ بنواتے تو دور اندیش کیوں کہلاتے۔ مقدم آسائش ہے۔ پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کاٹ ڈالنا دقیانوسی لوگوں کا کام ہے۔(۱۷۶)"

''اودھ پنچ''... چند تضادات

''اودھ پنچ'' کے مزاح نگاروں کی تخلیقات کے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''اودھ پنچ'' کے مزاح کا معیار بہت بلند نہ تھا۔ یہ دوسرے درجے بلکہ کبھی کبھی تیسرے درجے کا مزاح ہوتا تھا۔ اگرچہ ''اودھ پنچ'' نے مزاح نگاری کے بعض نہایت اعلیٰ نمونے بھی پیش کیے لیکن پھکڑ پن، غیر شائستگی، طولِ کلام، اور ایک ہی نکتے کی وضاحت ''اودھ پنچ'' کے مزاح کا عیب ہے۔ البتہ سید محمد آزاد ''اودھ پنچ'' کے مزاح نگاروں میں سب سے قد آور ہیں۔ درحقیقت ''اودھ پنچ'' کے گلِ سرسبد وہی ہیں۔ ان کے بعد منشی سجاد حسین نے بھی اردو مزاح میں اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے وقیع اضافے کیے۔

جہاں تک ''اودھ پنچ'' کے موضوعات کا تعلق ہے، ''اودھ پنچ'' کا زیادہ تر زور سید احمد خاں، علی گڑھ تحریک، نیچریت، مغربی تہذیب کے خلاف صرف ہوا۔ گو دیگر سماجی و تہذیبی مسائل بھی اس کا موضوع تھا، مثلاً شہری مسائل، حکومت و ریاست، موسم تہوار، رسومات وغیرہ۔

لیکن ''اودھ پنچ'' میں کچھ تضادات ایسے نظر آتے ہیں جو کھٹکتے ہیں۔ مثلاً مذہب کو لیجیے۔ ''اودھ پنچ'' کے مدیر اور لکھنے والے خود کوئی مذہبی آدمی نہ تھے لیکن مذہب کے بارے میں بہت حساس تھے اور سید احمد خاں کے مذہبی عقائد اور ان کی ''نیچریت'' کو اکثر نشانۂ طنز و تضحیک بناتے تھے جب کہ ان کا کوئی مذہبی حلقہ نہ تھا لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ شیعہ سنّی اختلافات اور فسادات کے خلاف اکثر ''اودھ پنچ'' میں وعظ و تلقین ہوتی تھی۔ یہ لوگ کانگریسی تھے اور کانگریس سیکولر ہونے کی دعوے دار تھی۔ گویا ایک طرف مذہب میں سیکولرازم تھا اور دوسری طرف مذہب میں سید احمد خاں کی تحریف اور تصرف کی زبردست مخالفت؟

پھر انگریزوں کی حمایت کے مسئلے کو لیجیے۔ ایک طرف تو ''اودھ پنچ'' میں حکومت اور انگریزوں پر اتنی کڑی تنقید ہوتی تھی کہ جب پنڈت کشن پرشاد کول ''گلدستۂ پنچ'' مرتب کرنے بیٹھے تو بعض مضامین اس میں شامل نہ کیے کیوں کہ:

''بعض نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین اس وجہ سے شامل نہ کیے جا سکے کہ خوف تھا کہ ان کی آزاد خیالی اور بیباکانہ طرزِ تحریر ممکن ہے کہ پریس

ایکٹ کے طبع گرامی کے لیے بارِ خاطر ہو۔(۱۷۷)''

یعنی انگریزوں کے دور میں بھی سجاد حسین ایسے بیباکانہ مضامین چھاپتے تھے جو بعد میں (''گلدستۂ پنچ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں چھپا) کتابی صورت میں چھاپے نہ جا سکے۔ حیرت ہوتی ہے کہ سجاد حسین کی اس آزادہ روی کو انگریزوں نے کیسے برداشت کیا جب کہ دیگر اخبارات و جرائد پر برطانوی حکومت کڑی نظر رکھتی تھی بلکہ اخبارات پر پابندیاں بھی عائد کر دیتی تھی۔ نیز ''اودھ پنچ'' میں بعض انگریزوں کی تعریف بھی چھپتی تھی جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ کانگریس انگریزوں کی آشیرباد کے نتیجے ہی میں بنی تھی اور اس کی تشکیل سلطنتِ برطانیہ کی ایک خیرخواہ اور وفادار جماعت کی حیثیت سے ہوئی۔ لہٰذا سجاد حسین اور ان کے رفقا کے آزادی کے دعوے اور سید احمد خاں اور انگریزوں کی مخالفت ایک عجیب اور پراسرار معاملہ بن جاتی ہے۔ ''اودھ پنچ'' کے صفحات پر انگریزوں کی تعریف اور تضحیک کا سلسلہ برابر متوازی طور پر چلتا تھا۔ یہ دہری پالیسی بعید از فہم ہے اور کسی واضح نتیجے پر پہنچنے سے روک دیتی ہے۔

مغربی تعلیم کو لیجیے۔ ''اودھ پنچ'' کے مدیر اور اس کے بعض لکھنے والے کیننگ کالج لکھنؤ کے تعلیم یافتہ یا ادھوری تعلیم چھوڑ کر بھاگے ہوئے تھے، یا بہرحال انگریزی سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے لیکن اکثر مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ اکبر کو لیجیے۔ خود سرکاری ملازم تھے لیکن مغربی تعلیم و تہذیب کے مخالف تھے اور اپنے بیٹے کو حصولِ تعلیم کے لیے لندن بھیجا۔ مچھو بیگ ستم ظریف کے بارے میں چکبست لکھتے ہیں کہ وہ آخری عمر میں کوٹ پتلون پہننے لگے تھے۔(۱۷۸) اور ان کے مسلک کے صلح کُل ہونے کا یہ عالم تھا کہ مرتے دم تک ان کے شیعہ یا سنّی ہونے کا پتا نہ چل سکا۔(۱۷۹) یعنی تہذیبِ مغربی کے مخالف بھی تھے اور کوٹ پتلون بھی پہننے لگے۔ مذہب میں ''نیچریوں'' کی دخل اندازی پر اعتراض تھا لیکن مسلک کے بارے میں کوئی خاص تکلف نہ تھا۔

''اودھ پنچ'' کی اس روش کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں کہ کس طرح لوگوں کو بالجبر سالانہ خریدار بنایا جاتا تھا اور پھر ان نکتہ چینی کا سلسلہ روک دیا جاتا تھا۔

یہ سب تضادات ''اودھ پنچ'' کو ایسا عجیب و غریب بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اس کے

سماجی اور سیاسی مسلک پر کھل کر کچھ کہنا خطرے سے خالی نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ مزید شواہد دریافت ہونے پر سید احمد خاں کی طرح ''اودھ پنچ'' کے بارے میں بھی کہا جا سکے کہ اسے بھی انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔

بہرحال ''اودھ پنچ'' کے تین کارنامے ایسے ہیں جو اسے رہتی دنیا تک اردو ادب اور اردو مزاح میں زندہ رکھیں گے۔ اوّل اس نے صفحات کو ایک باقاعدہ مشن اور مسلک بخشا۔ دوم اس نے مزاحیہ صحافت کو اتنا مقبول بنایا کہ ایک طویل عرصے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی اور اس کے تتبع میں کئی مزاحیہ جریدے نکلے جنھوں نے مزاح کو مزید فروغ دیا۔ سوم اس نے اردو مزاح کا باقاعدہ تشکیل اور صورت پذیری میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اس سے قبل اردو مزاح بے قاعدہ سا تھا۔ غالب نے صحیح معنوں میں اس کی بنیاد رکھی اور ''اودھ پنچ'' نے اسے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اتنا وقیع بنا دیا کہ جعفر زٹلی اور غالب کے بعد ''اودھ پنچ'' اردو مزاح کا اہم ترین موڑ بن جاتا ہے۔

نور الآفاق

علی گڑھ تحریک اور سید احمد خاں کے ردعمل کے طور پر جو جرائد نکلے ان میں ''نور الآفاق'' بھی شامل ہے۔ یہ کان پور سے ۳۰ اگست ۱۸۷۳ء کو جاری کیا گیا۔ یہ پندرہ روزہ تھا۔ ''نور الآفاق'' ''تہذیب الاخلاق'' کے جواب میں جاری کیا گیا تھا جیسا کہ اس کے ایک شمارے میں وضاحت کی گئی:

> ''ان دنوں ہندوستان میں ایک قرن شیطان پیدا ہوا، جس کے سبب سے عجب فتنہ ہویدا ہوا... سیرتِ انبیاء کی اہانت ہونے لگی۔ تحریفِ کتاب وسنت آئمۂ دین پر بغاوت ہونے لگی... الحادی باتوں کے شائع کرنے کو ایک پرچۂ اخبار نیا ایجاد کیا اور بمصداقِ مصرعہ برعکس نہند نام زنگی کافور بہ تہذیب الاخلاق نام نہاد کیا۔ پس حامیانِ اسلام کی طرف سے جوابِ شبہات ان ملاحدہ کا قلم بند ہونا اور اس کا شائع ہونا [؟] ہوا لہٰذا پرچہ نور الآفاق لدفع ظلمۂ اہل انفاق باجازت اہل اسلام جاری کرنا واجب ہوا۔(۱۸۰)''

''نور الآفاق'' میں سید احمد خاں کے معروف مخالف مولوی سید امداد العلی اور علی بخش بھی لکھا کرتے تھے۔ مثلاً امداد العلی نے ۱۳ مارچ ۱۸۵۷ء کے شمارے میں ''تہذیب الاخلاق'' کے شمارہ ۵ میں شامل سید احمد خاں کی ایک تحریر کا جواب دیا۔ علی بخش کا ایک خط ۲ جنوری ۱۸۷۴ء کے شمارے میں ملتا ہے۔ اسی طرح منشی چراغ علی کی تحریر مطبوعہ ''تہذیب الاخلاق'' کا جواب مولوی محمد علی نے ۱۸۵۷ء کے بعض شماروں میں لکھا۔ محسن الملک سید مہدی علی (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۷ء) کی ایک تحریر مطبوعہ ''تہذیب الاخلاق'' شمارہ ۱۷ کا جواب مولوی حکیم وکیل احمد سکندر پوری نے تحریر کیا۔(۱۸۱)

''نور الآفاق'' کی تحریروں میں مناظرے کا انداز ملتا ہے۔ اس کا اسلوب کہیں کہیں طنزیہ ہے۔ مثلاً سید احمد خاں کے مذہبی عقائد پر ایک جگہ مولوی محمد علی نے اس طرح طنز کیا:

> ''کیا خوب معنی حدیث و قرآن کے سمجھے کہ کوئی دقیقہ نچھوڑا [نہ چھوڑا] اور ازراہِ تقیہ کے جو یہ الفاظ زبان پر لائے کہ اوس [اس] وقت کے مسلمانوں کا اندیشہ و تام اونکی [ان کی] پرہیز گاری پر دال ہے... اصحاب پیغمبر صلعم رضوان اللہ علیہم پر طعن کرنے کو غلو کچھ کم نتھا [نہ تھا] اب تو اوس کے [اس کے] ساتھ اتباع جنابِ معلمِ اوّل و ثانی اور آفتِ الحاد کے قرین ہو کر کریلا اور نیم چڑھا بن گئے۔ دل کے پھپھولے پھوڑنے کو یمن عنایت و حمایتِ جناب سید احمد خاں کے خوب موقع ملا۔(۱۸۲)''

(د) علی گڑھ تحریک کا معاصر مزاح

اس دور میں علی گڑھ تحریک کے مزاح اور ''اودھ پنچ'' کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسا معاصرانہ مزاح بھی تخلیق کیا جا رہا تھا جو ہر دو سے الگ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے نمایاں ترین لکھنے والے سرشار تھے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء؟-۱۹۰۳ء)

''اودھ پنچ'' میں لکھنے والوں کے حلقے میں سرشار (۱۸۳) شامل رہ چکے تھے لیکن ۱۸۷۸ء میں ''اودھ اخبار'' (۱۸۴) کا مدیر بننے کے بعد انھوں نے ''اودھ پنچ'' کی بجائے ''اودھ اخبار'' میں لکھنا شروع کیا۔ اس میں دسمبر ۱۸۷۸ء تا دسمبر ۱۸۷۹ء ''فسانۂ آزاد'' قسط وار چھپتا رہا اور ۱۸۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ''اودھ پنچ'' پہلے ہی ''اودھ اخبار'' کے خلاف تھا۔ ''فسانۂ آزاد'' پر بھی اس نے جا و بے جا اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور دونوں طرف سے دندان شکن جواب دیے جانے لگے حتیٰ کہ منشی سجاد حسین ایڈیٹر ''اودھ پنچ'' اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میں، جو پرانے دوست تھے، بات چیت بند ہوگئی۔(۱۸۵)

''اودھ اخبار'' اور ''اودھ پنچ'' میں معاصرانہ چشمک کی دیگر وجوہات میں سے ایک غالبًا یہ بھی تھی کہ ''اودھ پنچ'' آزادیٔ ہند کا حامی اور انگریز حکومت کا نقاد تھا۔ جب کہ ''اودھ اخبار'' کی پالیسی انگریزوں کی مدح سرائی تھی بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہدوں اور شہیدوں کے بارے میں ''اودھ اخبار'' کی خبریں اور تبصرے افسوس ناک ہوتے تھے۔(۱۸۶)

''فسانۂ آزاد'' کی تصنیف کا منشا ظرافت پیدا کرنا ہی تھا۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے سرشار سے دون کی ہوتے ("Don Quixote") کے مزاح کی اتنی تعریف کی تھی کہ سرشار کے دل میں اسی انداز سے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔(۱۸۷) ابتدًا انھوں نے لکھنؤ اور اس کے رسوم و رواج اور تہذیب پر چند مضامین مزاح کے پیرائے میں لکھے اور بعد کو اسے ایک مستقل سلسلے کی شکل دے دی۔ اس کے پلاٹ کے بے سر و پا پھیلاؤ اور چند دیگر فنّی اقسام کی بنا پر ''فسانۂ آزاد'' کے ناول ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب جو تقریبًا ڈھائی ہزار صفحات پر محیط ہے سرشار کا شاہکار ہے۔

ان کے دیگر ناولوں میں ''جامِ سرشار'' (۱۸۸۷ء)، ''سیرِ کہسار'' (۱۸۹۰ء)، ''کامنی''، (۱۸۹۴ء)، ''کڑم دھم'' (۱۸۹۴ء)، ''بچھڑی ہوئی دلہن''، ''پی کہاں''، ''ہشو'' اور ''طوفانِ بے تمیزی'' (۱۸۹۴ء) شامل ہیں۔ ''گورِ غریباں'' غیر مطبوعہ ہے جب کہ ''چنچل نار'' نامکمل رہا۔ تراجم میں ''شمس الضحیٰ'' (۱۸۷۸ء) اور ''الف لیلہ'' (۱۹۰۱ء) شامل ہیں۔ ''ڈان کوئک زوٹ''

کا ترجمہ بھی سرشار نے کیا۔ یہ ''خدائی فوجدار'' کے نام سے ۱۹۰۳ء میں چھپا۔(۱۸۸)

سرشار کے ہاں مزاح پیدا کرنے کے لیے مختلف حربے ملتے ہیں، مثلاً بذلہ سنجی (wit)، عملی مذاق، بھانڈوں والا مزاح، اچھل کود، لپاڈگی، مضحکہ خیز واقعات، مزاحیہ کردار، ضلع جگت، زبان و بیان کے استعمال سے مزاح اور مبالغے سے پیدا ہونے والا مزاح وغیرہ۔ کبھی کبھی پیروڈی اور طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ البتہ ان کے مزاح میں چابک دستی اور لطافت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ رمز (irony) اور کم بیانی (Under-Statment) جس میں نواب سید محمد آزاد کو ملکہ حاصل ہے، سرشار کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ ان کا طنز بھی اکثر براہِ راست اور تلقینی انداز کا ہوتا ہے۔

سرشار قارئین کے ساتھ ساتھ ہنستے ہیں، بلکہ وہ خود زیادہ ہنستے ہیں۔ وہ اپنے مزاح سے خود ہی لطف اندوز ہوکر اسے دُہراتے ہیں یا اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں فسانۂ آزاد میں موجود ہیں۔(۱۸۹)

''فسانۂ آزاد'' میں مزاح پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ خوجی ہے۔ مزاحیہ کردار کی جو تین بنیادی قسمیں بتائی گئی ہیں خوجی کا تعلق ان میں سے پہلی قسم سے ہے۔(۱۹۰) یعنی انھیں ہر میدان میں برتری کا دعویٰ ہے۔ ان کی نفسیاتی پیچیدگی یہ ہے کہ کمزور جثّے کے باوجود یہ خود کو پہلوان اور سپاہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے ہر ایک سے بھڑ جاتے ہیں۔ یہیں مزاح پیدا ہوتا ہے۔

خوجی اور حاجی بغلول کے کردار کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دونوں خود کو بہادر، ہر فن میں کامل اور حسین تصور کرتے ہیں لیکن دونوں نفسیاتی عدم توازن کا شکار ہیں۔ حاجی بغلول اور خوجی میں اس قدر مشترک کے علاوہ ایک فرق بھی ہے۔ حاجی بغلول کبھی کبھی احمق (Fool) بھی لگتے ہیں اوور خوجی کبھی کبھی مسخرے (Buffoon)، یعنی خوجی کی حماقت کبھی کبھی خود اختیار کردہ ہوتی ہے۔ دراصل سرشار نے دیگر کرداروں کی طرح خوجی کا کردار تخلیق کرتے ہوئے بھی کسی اصول اور باقاعدگی کا خیال نہیں رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خوجی اکثر تو نفسیاتی عدم توازن کا شکار نظر آتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ احمق اور مسخرے بھی لگتے ہیں۔

خوجی اور حاجی کے مصنفوں نے جو مزاح ان کرداروں کی مدد سے پیدا کیا ہے وہ بڑی

حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہے۔ یعنی ضلع جگت اور حرکات کا مزاح۔ سجاد حسین کے اسلوب میں البتہ تبصرے اور گفتگو کا انداز ہونے کی بنا پر کہیں کہیں ایک بہتر صورت مزاح کی ابھرتی ہے لیکن حرکات کا مزاح خاصا مماثل ہے۔ مثلاً جس طرح حاجی صاحب گھوڑی پر سوار ہوتے ہوئے جھجکتے ہیں اور بالآخر گر پڑ کر سوار ہو پاتے ہیں اسی طرح خوجی میاں بھی ٹٹو کی سواری کے وقت کم و بیش یہی منظر پیش کرتے ہیں۔

سرشار کا دوسرا مزاحیہ کردار جو قابلِ ذکر ہے وہ منشی مہاراج بلی کا کردار ہے جس میں پیرانہ بوالہوسی سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ سرشار کے مزاح میں عمومیت یا عوامیت زیادہ ہے۔ یہ اکثر بھانڈوں والا اور اچھل کود والا مزاح ہے۔ اس کا اثر بھی دیرپا نہیں۔ اس میں پھلجڑی کی طرح چند لمحوں کے لیے مسرور کرنے اور بھڑکتے ہی بجھ جانے والی کیفیت ہے۔ اس میں تازگی ہے توانائی نہیں۔(۱۹۱) سرشار کے اس عام قارئین کو خوش کرنے والے اور پھبتی اور ٹھٹھول پر مبنی مزاح کی تخلیق کی دو وجوہ نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرشار کا تعلق اودھ پنچ گروہ سے رہ چکا تھا اور ''اودھ پنچ'' کے مزاح کا معیار اور کیفیت کچھ یہی عوامی انداز لیے ہوئے تھی۔ یہ مزاح کبھی کبھی چمک کر لمحے بھر کے لیے بذلہ سنجی (wit) کی سطح تک ضرور اٹھتا تھا لیکن اس کا عمومی رنگ سوقیانہ پن لیے ہوئے ہی تھا۔ دوسری وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ''فسانۂ آزاد'' روزنامے میں قسط وار چھپتا تھا۔ اس کا ایک بڑا مقصد قارئین کی دلچسپی اور اخبار کی تعدادِ اشاعت کو برقرار رکھنا بھی تھا چنانچہ عوام کی توقع اور پسند پر پورا اترنے کے لیے یہ رنگ اختیار کرنا ضروری تھا۔

سرشار کے مزاح کا سیاسی اور سماجی پس منظر

''فسانۂ آزاد'' کے معروف ترین کردار خوجی کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ یہ فوٹو گراف نہیں بلکہ مضحک خاکہ (Caricature) ہے۔(۱۹۲) اسی طرح سرشار نے لکھنوی سماج کی جو تصویر کھینچی ہے اس پوری تصویر کو بھی مضحک خاکے یا کیری کیچر سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۱۹۳) جس طرح کارٹون میں کسی شخص کی مضحکہ خیزی، بوالعجبی اور ہیئت کذائی کو نمایاں کرنے کے لیے اس کے چہرے کے خطوط کو دانستہ بگاڑا جاتا ہے تاکہ وہ اس سے کہیں زیادہ بھونڈے نظر آئیں جتنے وہ

درحقیقت ہیں اور دیکھنے والے اس کی خامیوں کی طرف متوجہ ہو جائیں، اسی طرح سرشار نے لکھنؤ کے سماج کو اس سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز، بے معنی اور خامیوں کی پوٹ بنا کر پیش کیا جتنا کہ درحقیقت وہ تھا۔ اس کی غرض و غایت وہی ہے جو کارٹون کے بگڑے ہوئے خطوط کی ہوتی ہے، یعنی خامیوں کی جانب توجہ مبذول کرانا۔

سرشار کا دور مغربی افکار کی بے پناہ توسیع و ترویج کا دور تھا۔ مغربی تہذیب انگریز فاتحین کے ذریعے نہ صرف برعظیم کے طول وعرض میں گھر گھر دستک دے رہی تھی بلکہ اس نے آبادی کی تعلیم یافتہ حصے کی اکثریت کے اذہان کو اپنے افکار و مادّی ترقی سے مسخر و مرعوب کرلیا تھا۔ سرشار انگریزی سے براہِ راست واقف تھے اور ان کا انگریزی کا اچھا خاصا مطالعہ تھا۔ وہ مغرب سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، بالخصوص مغرب کی علمی و ذہنی ترقی، مادّی خوش حالی اور طرز معاشرت سے۔ شاید مغرب کو ہر لحاظ سے بہت اچھا سمجھ لینے کی وجہ ہی سے انھوں نے مقامی معاشرت وتمدن کو بہ نظرِ حقارت دیکھا۔ گو وہ برعظیم کے تمدن کی اچھی باتوں کی ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتے جاتے ہیں لیکن ان کو اس کا موقع کم ہی ملا ہے۔ اس سلسلے میں نواب سید محمد آزاد کا تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ سرشار اور سید محمد آزاد عصری رجحانات سے واقفیت کے معاملے میں اپنے معاصر مزاح نگاروں سے کہیں آگے نظر آتے ہیں لیکن آزاد کی خوبی یہ ہے کہ وہ مغرب کی برائیوں پر بڑے لطف کے ساتھ چوٹ کرتے ہیں اور ضمنی طور پر مقامی تہذیب کی خامیوں پر بھی انگلی اٹھاتے ہیں۔ سرشار کے ہاں یہ ترتیب اس کے برعکس ہے بلکہ اپنی تہذیب کی خوبیاں سرشار کو کم ہی نظر آتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نواب آزاد بنیادی طور پر ''اودھ پنچ'' کے مکتبہ فکر سے وابستہ تھے اور سرشار ''اودھ پنچ'' مخالف گروپ میں شامل تھے جو بڑی حد تک انگریزوں کا حامی تھا۔

سرشار نے نئے خیالات اور مغربی افکار و تمدن کو خوش آمدید کہا۔ ان کو ذہنی طور پر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے ساتھ نتھی کرنا تو صحیح نہ ہوگا لیکن ان کے خیالات بڑی حد تک اس قسم کے تھے جو بہ آسانی سید احمد خاں کے ہم خیال ادباء و رفقاء میں ان کو جگہ دلوا سکتے تھے۔

سرشار تعلیمِ نسواں، مغربی خیالات، جدید علوم اور عقلیت کے حامی تھے۔ قدیم رسومات،

توہم پرستی، عقائد پرستی، منشیات، بے سرو پا مذہبی رسوم، کاہلی، نوابوں کی فضول خرچی اور قبیح عادات، فرسودہ رواج سے چڑتے تھے اور ان پر انھوں نے جا بجا چوٹ کی ہے۔

سرشار نے برعظیم اور لکھنؤ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ان کے عروج کے دور کی نہیں ہے بلکہ اس وقت کی ہے جب اس زوال پذیر معاشرے کا زوال اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ مغربی خیالات کے سیلاب نے لوگوں کے اذہان میں آندھیاں بپا کر رکھی تھیں اور یہ آندھیاں عقائد کو جڑ سے ہلانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس وقت کا برعظیم اور بالخصوص لکھنوی معاشرہ جس "بابر بہ عیش کوش" اور فراری ذہنیت میں مبتلا تھا اور جو برائیاں اسے گھن کی طرح چاٹ رہی تھیں، سرشار نے انھیں موضوع بنایا۔ کہیں ظرافت اور خوش طبعی کے ساتھ اور کہیں تلقین اور تلخی کے ساتھ انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"فسانۂ آزاد" کی ضخامت کی وجہ سے سرشار کے ہاں بے شمار کردار ملتے ہیں۔ احمق نواب، خوشامدی مصاحب، بے وقوف بنا کر لوٹنے والے چاپلوس، چانڈو باز، پرانی وضع کے بزرگ، زبان دراز بھٹیارنیں، مُلّائے مکتبی، تیز مغلانیاں، گھٹتی ہوئی بیگمات، لکھنؤ کے بے فکرے، انگریز... غرض ایک وسیع اور رنگارنگ کینوس ہے جس میں یہ سب مل کر رنگ بھرتے ہیں۔ ان کی مدد سے سرشار نے بڑی دلچسپ تصویریں اور مرقعے پیش کیے ہیں۔

پرانی طرز کے مکاتب و مدارس اور ان کے نااہل مُدرّسوں پر سرشار نے جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ مثلاً:

> "ایک دن بازار کی طرف جا نکلے تو مکتب خانہ نظر سے گزرا۔ ٹوٹا پھوٹا مکان، پرانا دھرانا دالان۔ دیواریں بابا آدم کے وقت کی۔ ایک مولوی صاحب دقیانوس کے ہم عصر بیٹھے ہل ہل کر پڑھا رہے ہیں اور بیس پچیس کم سن لڑکے زٹل قافیہ اڑا رہے ہیں۔(۱۹۴)"

سرشار کو تعلیم اور نظامِ تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ تعلیم کو قوم میں ذہنی انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے کئی جگہوں پر تعلیمی مسائل و نظریات کا تذکرہ کیا ہے اور قدیم طریق تعلیم کی خامیوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔

لکھنؤ کے نوابوں کے حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

"رئیسوں کو مرض ہے کہ پہلوان، پھکیت، بنوٹیے کو ساتھ رکھیں۔ تبھی پر لے کر ہوا کھانے نکلیں۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ ... تنے ہوئے جا پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نواب صاحب اپنی ماں کے لاڈلے، اندھیرے گھر کے اجالے، بھولے بھالے، مسند پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ تمام عمر زنان خانہ ہی میں پرورش پائی تھی۔ کبھی گھر کے باہر جانے تک کی نوبت نہ آئی تھی... دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یاروں دوستوں سے گپیں اڑانا، کبھی چوسر کا رنگ جمایا۔ کبھی بازی لڑی، کبھی پو پر گوٹ اڑی، کبھی سہ بازی دینی پڑی... کبھی دل گھبرایا تو مدک کا دم لگایا۔ چانڈو کے چھینٹے اڑائے۔ افیون کی چسکی لی۔(۱۹۵)"

ایک جگہ ایک احمق نواب کا قصہ بٹیر بازی بیان کرتے ہوئے نہایت پُر لطف طریقے سے نوابوں، بٹیر بازی اور خوشامدی مصاحبوں پر چوٹ کی ہے۔ اس قصے میں بتایا ہے کہ کس طرح بٹیر بازی کے شوقین ایک نواب کا بٹیر جس کا نام صف شکن ہے آزاد چھپا دیتے ہیں تو نواب صاحب اس کے لیے کس طرح ہلکان ہوتے ہیں۔ آخر کار مصاحب اس بٹیر کو "عارف و قلعی و بزرگ صف شکن علی شاہ" بنا کر اس کا مزار بھی تعمیر کروا دیتے ہیں۔

نواب صاحب کے مصاحب بٹیر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"حق ہے۔۔ اے حضور وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔ دوسرے بولے خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔ تیسرے نے کہا قسم ہے پنجتن پاک کی میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ چوتھے: ایک دن ہنس رہا تھا۔ پانچویں: اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے... یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ حقانی جانور ہے۔ صورت بٹیر کی مگر سیرت فقرا کی اور ایک پنڈت نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہو گئی نہیں تو اس کا بڑا درجہ تھا۔(۱۹۶)"

خوجی کہتے ہیں: ''مولانا صاحب وہ بٹیر ہے۔ مگر خوش تمیز، عارف زاہد، عفت کوش، متقی متشرع، منطقی، فلسفی، ہیئت دان، عربی خوان۔(۱۹۷)''

یہ سارا قصہ نوابوں کی حماقت، خوشامدیوں کی منافقت اور جہلا کی خوش عقیدگی پر طنز ہے کہ بٹیر کو زاہد و منطقی مانا بلکہ اس کا مزار بھی بنوا دیا۔ گو ایسے احمق نواب ملنا عقلاً محال ہے لیکن یہاں وہی کارٹون بنانے والی کیفیت ہے۔ مبالغے اور افراط سے طنز کا کام لیا گیا ہے تا کہ لکھنؤ کے خوش باش اور عیش وعشرت میں مست معاشرے کی تصویر ابھر سکے۔

اسی طرح ''فسانۂ آزاد'' میں شامل ''رنگے سیار'' نامی قصبے میں سرشار نے جعلی پیروں کو خوب لتاڑا ہے اور سیدھے سادھے لوگوں کی عقیدت سے نام نہاد مرشدوں کے فائدے اٹھانے کا ذکر کیا ہے۔ البتہ اچھے اور صحیح العقیدہ بزرگوں کا بھی ایک جگہ ذکر ہے۔ اس قصے میں برعظیم کے مختلف رسوم ورواج مثلاً شادیوں کی مسرفانہ اور فضول رسومات پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ لیکن یہ سب نیم ظریفانہ اور نیم خطیبانہ انداز میں ہے۔ آسیب اتارنے اور حاضرات کے عمل پر بھی چوٹ کی اور اسے توہم پرستی قرار دے کر دکھایا ہے کہ کس طرح لوگ زلزلے کے اثرات کو بھی جن بھوتوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ جن اُتارنے کا منظر بھی خاصا طویل ہے اور نیم طنزیہ۔(۱۹۸)''

دراصل ''فسانۂ آزاد'' کا کینوس اتنا وسیع ہے اور قدم قدم پر اتنا سماجی اور تہذیبی مواد مزاح کے پردے میں ملتا ہے کہ ان سب کو سمیٹنا ناممکنات میں سے ہے۔ مثلاً خوجی کا غلط فارسی بولنا بھی ایک طنز ہے۔ کیوں کہ اس دور میں فارسی بولنا وجہ افتخار تھا جیسا کہ آج کل انگریزی بولنا اور غلط فارسی بولنا اس افتخار کی تلاش کی علامت ہے۔ اسی طرح خوجی کا بار بار قرولی تلاش کرنا لکھنؤ والوں کے اس زعم کی طرف اشارہ ہے جو کھوکھلا ہے۔ یہ بھی طنز ہے۔ اسی طرح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ بہر حال چند نمونے مزید:

> ''عید کا چاند ہونے پر اختلاف کوئی آج کل کا شاخسانہ نہیں یہ سرشار کے دور میں بھی موجود تھا۔ دیکھیے:
>
> نواب: آپ کو بھی مبارک ہو مگر سنا کہ آج تو عید میں اختلاف ہے۔
>
> بھئی آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں اچھا۔

مصاحب: حضور فرنگی محل کے علمائے تسنن نے تو آج ہی پنجشنبہ کو عید کا فتویٰ لگایا ہے لیکن جناب قبلہ و کعبہ نے فرمایا ہے کہ ہماری عید کل ہے۔(۱۹۹)"

یہاں شیعہ سنی اختلاف پر بھی انگشت نمائی ہے، گو سرشار خود ہندو تھے۔

جس طرح رجب علی بیگ سرور نے لکھنؤ کی محبت "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں لکھنؤ کی مبالغے سے تعریف کی ہے اسی طرح جب سرشار پر لکھنؤ کی محبت غالب آجاتی ہے تو وہ بھی سرور کے انداز میں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آزاد اور خوجی کے لکھنؤ پہنچنے پر کچھ سرور ہی کے انداز میں کہتے ہیں:

"محمود طبلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا تو خوش الحانی میں صادق علی خاں کو باربد نژاد پایا۔ باباجی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ فرنگی محل ہے یا خطۂ یونان۔ یا علما فضلا کی کان... اطباء میں ایک سے ایک برق حکیم مرزا محمد جعفر کی طباعت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ھوالشافی نسخے میں لکھنے بھی نہ پائے کہ مریض نے صحت کامل پائی (۲۰۰)"

"فسانۂ آزاد" میں قصہ در قصہ کی تکنیک ہونے کی وجہ سے اس میں کئی ایسے قصے بھی ملتے ہیں جن کا اصل کہانی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ "فرسٹ کلاس جنٹلمین" کا قصہ بھی اس ذیل میں آتا ہے۔ اس میں ایک ایسے ٹھاکر صاحب کا قصہ بیان ہوا ہے جو فرسٹ کلاس جنٹلمین بننا چاہتے ہیں اور اس شوق میں نہ صرف مہنگی مہنگی انگریزی شرابیں پیتے ہیں بلکہ اپنے گاؤں بیچ کر وہ تمام لوازمات بہم پہنچانے کو تیار ہیں جن کی مدد سے وہ جنٹلمین بن سکیں۔ فرماتے ہیں:

"لاحول ولا قوۃ۔ بھائی جان ہم کچھ نشہ کے لیے تھوڑا ہی کلیرٹ پیتے ہیں ہم کو تو اس کلیرٹ مردار کا ذائقہ ہی پسند نہیں ہے۔ مگر مجبوری ہے۔ جنٹلمین کھانے کے بعد گرمی کی فصل میں کلیرٹ ضرور پیتے ہیں اور ہم بھی جنٹلمین اور اعلا درجے کے۔(۲۰۱)"

اس پر ان کے دوست یوں انھیں سمجھاتے ہیں:

''نامعقول۔ بس جنٹلمینوں کا تتبع شراب ہی پینے میں ہے یا کسی اور بات میں بھی، تین روپیہ تو مکان کا کرایہ دیتے ہیں آپ اور دعویٰ یہ کہ ہم جنٹلمین ہیں... آپ کو جنٹلمینی مبارک ہو۔ پھر دھوتی کیوں پہنتے ہو، کھانے میں وہی ہندو پن، بھتی اور موٹی موٹی روٹیاں۔ جنٹلمین تو مٹن چاپ اڑاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ پی تو پانچ روپیہ بوتل کی شمپین اور چوکے میں جاکے دال روٹی کھائی۔ لالہ کچوری مل، جنٹلمین بننا دل لگی نہیں ہے شیری اور شمپین پینے سے بھی کوئی جنٹلمین بنا ہے۔ آپ کوٹھی کی کوٹھی پی جایئے تو کیا۔ جنٹلمین کی اور ہی صفتیں ہیں۔(۲۰۲)''

اس فرسٹ کلاس جنٹلمین بننے کے شوقین مقامی کا انجام سرشار نے یہ دکھایا ہے کہ ہم وطن تو ان پر ہنستے ہی ہیں، انگریز بھی ان پر بگڑتے ہیں اور بے تحاشا اخراجات اس کے علاوہ۔ یہاں ہمیں بے اختیار نذیر احمد کا ''ابن الوقت'' یاد آتا ہے جو انگریز بننے کے شوق میں نہ ادھر کا رہتا ہے نہ ادھر کا۔ ''فسانۂ آزاد'' کتابی صورت میں ۱۸۸۰ء میں چھپی جب کہ ''ابن الوقت'' ۱۸۸۸ء میں۔ اس لحاظ سے سرشار کو اس معاملے میں تقدم حاصل ہے کہ انھوں نے اس تہذیبی کشمکش کی بازگشت کو سب سے پہلے پیش کیا جو اس دور میں رفتہ رفتہ مسئلہ بنتی جارہی تھی۔

سرشار ویسے تو نئی روشنی اور نئے خیالات کے زبردست حامی تھے۔ انگریزوں کی تعریف بھی ان کے ہاں جابجا ملتی ہے۔ خصوصاً انگریزوں کے اچھے اور صحت مندانہ طرز معاشرت کے وہ شدت سے قائل نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں فرسٹ کلاس جنٹلمین میں انھوں نے واضح کردیا ہے کہ مغربی تہذیب کی اچھائیاں اپنانے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا تتبع آنکھیں بند کرکے کیا جائے۔ وہ مغرب کی اچھی اور آرام دہ چیزوں کو اپنا لینے کے حق میں تھے۔ مثلاً ان کے نزدیک ہوٹل میں جاکر کھانا کھانا کوئی برائی نہیں۔ انھوں نے آزاد کو ہوٹل میں کھانا کھلوا کر یہ ثابت کیا۔ پھر وہ ریل کے سفر کو بہت محفوظ اور آرام دہ خیال کرتے تھے۔ ''فسانۂ آزاد'' ہی میں ایک ضمنی قصے بعنوان ''ریل کی سواری اور جنٹلمین'' میں پرانے فیشن کے ان لوگوں کا خاکہ اڑایا ہے جو اپنی حماقتوں اور پرانے خیالات کی وجہ سے ریل کی سہولیات کو الٹا عذاب بنالیتے ہیں اور پھر ریل

کے مخالف ہو جاتے ہیں۔(۲۰۳) اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جنٹلمین کے پاس سب سامان لیس تھا... مگر دقیانوسی کا منہ سل گیا تھا۔ ریل پر کھانا گناہ ہے۔ ایک اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں آدھ گھنٹہ ریل ٹھہرتی ہے۔ جب چھ منٹ رہے تو حضرت دقیانوسی پلیٹ فارم پر گئے۔ برہمن سے پانی لیا۔ منہ دھویا مگر جوتا اتار کے پانی پینے کو ہی تھے کہ سیٹی ہوئی۔ بوکھلا کے دوڑے تو ایک کھمبے سے ٹکر لگی۔ چوندھیا کے گرے مگر قہر درویش بر جان درویش پھر اٹھے۔ ریل چلنے ہی کو تھی کہ یہ درجے میں بیٹھ گئے۔ مگر جوتیاں غائب۔ اب سنیے کہ پیاسے رہے اور جوتا الگ غائب غلہ ہوا جنٹلمین جس مقام پر جاتے ہیں ان کی تعظیم ہوتی ہے۔ جو شے مانگتے ہیں فوراً ملتی ہے مگر ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔(۲۰۴)''

یہاں سرشار جنٹلمین کے حامی نظر آتے ہیں لیکن سرشار کا نقطۂ نظر وہی رہتا ہے کہ نئی تہذیب کی سہولتوں اور آسانیوں سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے اور اس سے مذہب پر بھی کوئی آنچ نہیں آتی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں شامل ''ریل پر کھانا گناہ ہے'' کے طنزیہ جملے سے عیاں ہے۔ یہی بات ''پرانے فیشن کے بزرگوار'' کے زیرِ عنوان دیے گئے اس مباحثے سے ظاہر ہوتی ہے جو میاں آزاد اور پرانے فیشن کے بزرگوار کے درمیان ہوتا ہے۔(۲۰۵)

''فسانۂ آزاد'' کے ناول ہونے یا نہ ہونے اور دیگر خامیوں کی بحث سے قطع نظر اس بات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ''فسانۂ آزاد'' اردو ناول کی تاریخ میں اسی لیے زندہ رہے گا کہ ایک مخصوص دور کا لکھنؤ اس کی بدولت زندہ ہے۔(۲۰۶) بلکہ اس پر اتنا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ''فسانۂ آزاد'' اپنے دور کی اس تہذیبی اور سیاسی کشمکش اور نظریاتی پیکار کو بخوبی نمایاں کرتا ہے جو مختلف قوتوں کے درمیان جاری تھی۔ سرشار نے لکھنوی تہذیب کی اس مہملیت اور مضحکہ خیزی کو پوری طرح واضح کیا ہے (اگرچہ اس کام کے لیے انھیں کارٹون یا کیری کیچر بنانا پڑا) جو اہلِ لکھنؤ کی باقی دنیا اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں سے لاتعلقی اور کھوکھلے زعم (جس کا نمائندہ خوجی اور جس کی علامت اس کی قرولی نہ ہونا ہے) کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں۔ جس چیز کو سرشار

ادیب آنے والے دنوں کا خواب دکھانے لگے۔ انگریزوں کی سیاست اور حکومت سے تو بیزاری بڑھتی گئی لیکن ان کی تہذیب نے رفتہ رفتہ برعظیم کو فتح کر لیا حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیڈر بھی مغربی لباس اور صفاچٹ داڑھی مونچھ کے نظر آنے لگے۔

ادھر ادبی افق پر بڑی اہم تبدیلی ہوئی جو ترقی پسند ادبی تحریک کی صورت میں تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں برپا ہونے والے روسی انقلاب کے اثرات کے تحت ۱۹۳۶ء میں اٹھنے والی اس ادبی تحریک نے برعظیم میں زور پکڑا تو رومانویت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے مخصوص نظریات کے تحت تخلیق کیے گئے ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو ادب کو دیا۔

اس دور کے اہلِ قلم انفرادی اور اجتماعی حالات سے حد درجہ غیر مطمئن تھے لہٰذا افسانوی ادب کا عام اسلوب بالخصوص اور پورے ادب کا لب و لہجہ بالعموم تلخ و طنزیہ بلکہ استہزائیہ اور تمسخرانہ ہو گیا۔ بقول سید عبداللہ (۱۹۰۶ء۔ ۱۹۸۶ء) ۱۹۳۵ء کے بعد کے سارے ادب میں تین چار رجحانات شدت سے کام کر رہے ہیں یعنی جدت کی تلاش، ادیبوں کی تلخی و جھنجھلاہٹ اور سہل انگاری (۶) ترقی پسند تحریک کے معاصر مزاح نگاروں نے بھی حالات و واقعات سے اثرات قبول کیے اور انھیں موضوع بنایا۔

اس باب میں ہم ۱۹۳۶ء سے لے کر آزادی تک کے مزاحیہ نثری ادب میں سیاسی و سماجی حالات کے عکس کا جائزہ لیں گے۔

(الف) اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

رومانویت کی تحریک نے عقلیت اور مقصدیت سے بغاوت کر دی تھی اور اپنے انداز میں ادب تخلیق کرتی رہی۔ لیکن حقیقت نگاری کی تحریک بھی رومانویت کی تحریک کے پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔ مثلاً ترقی پسند تحریک سے قبل کے ادب میں حقیقت نگاری کا یہ رجحان پریم چند کے ہاں خاص طور پر نمایاں ہے۔ البتہ ترقی پسند ادبی تحریک نے اپنی ابتدا کے چند برسوں کے اندر اندر رومانویت کی تحریک کو غیر مؤثر کر دیا۔ ترقی پسند تحریک ایک طرح سے حقیقت پسندی کی تحریک

تھی۔ اس کی پُر جوش عقلیت، خارجیت، حقیقت نگاری اور طبقاتی کشمکش اور عام انسانوں کو ادب کا موضوع بنانے کی شدید خواہش کے سامنے رومانویت کی لطافت، شعریت، داخلیت، ابہام اور تخیل کی پرواز بھلا کہاں ٹک سکتی تھی۔

۱۹۱۷ء میں جب بولشویکیوں (۷) نے زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ کر انقلاب برپا کیا تو پوری دنیا میں کچلے ہوئے طبقوں اور معاشی عدم مساوات کا شکار لوگوں میں مارکسزم (۸) نے امید کی لہر دوڑا دی۔ معاشی مساوات کے مارکسی نظریات نے دنیا بھر کے دانشوروں کو متاثر کیا۔

برعظیم میں بھی پڑھے لکھے طبقے میں مارکسی نظریات پہنچے اور ان کی بازگشت یہاں کے ادیبوں اور مفکروں کے ہاں سنائی دینے لگی۔ بعد میں ایسے تخلیق کاروں کی ایک باقاعدہ تنظیم بنی۔ اس تنظیم کی بنیاد لندن میں برعظیم کے چند ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں رکھی گئی جو لندن میں دوران تعلیم اشتراکیت کے فلسفے سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ایک ادبی حلقہ قائم کیا تھا۔ اس حلقے کو ہی بعد میں تنظیم کی شکل دی گئی اور اس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' (Indian Progressive Writers Association) رکھا گیا۔ اس کا ایک منشور بھی تھا اور آگے چل کر اسی تنظیم نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ (۹)

یہ تحریک اردو ادب کی تاریخ میں اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے کہ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کے بعد پہلی اور اردو ادب کی تاریخ میں دوسری شعوری کوشش تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ (۱۰) اس تحریک کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس تحریک نے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی اور برعظیم کی مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں میں اتحاد و اشتراک کا وسیلہ بن گئی۔ (۱۱)

یہ تحریک برعظیم کے طول و عرض میں مقبولیت سے ہمکنار ہوئی۔ لیکن پھر اسے کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اس کی مقبولیت کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو اس کے بانیوں کا خلوص اور لگن اور ان کی جدو جہد۔ دوسرے اس تحریک کی مقبولیت کے لیے راہ پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی۔ اگر یہ تحریک شروع نہ ہوئی ہوتی تو بھی پریم چند کی حقیقت نگاری اور بیسویں صدی میں برعظیم میں مختلف فلسفوں اور افکار کا فروغ جس میں اشتراکی فلسفہ بھی شامل تھا، اسی قسم کی کسی تحریک،

رجحان یا رویے پر منتج ہوتا۔(۱۲)

اس کے زوال میں بھی کئی عوامل شامل تھے۔ مثلاً تحریک کے مخصوص سیاسی (اشتراکی) عقائد اور ان کی طرف بعض ارکان کا بہت زیادہ جھکاؤ، تحریک کے بعض بانیوں اور اہم ارکان (مثلاً احمد علی) کی تحریک سے علاحدگی، حکومت کی طرف سے کمیونسٹ ٹھہرا کر ترقی پسندوں پر قید و بند کی سختیاں، خود تحریک میں اختلاف کی بنا پر تحریک کے بعض لکھنے والوں (مثلاً منٹو) کو مطعون کرنا اور ان کو رد کرنا، ایک مخصوص قسم کے ادب کی تخلیق پر اصرار اور ادب کو پروپیگنڈے کی سطح پر گرا دینا، عریاں نویسی اور مذہب و اخلاق و روایات کا مذاق اڑانے کی وجہ سے تحریک اور اس کے ادیبوں کی عام شہرت کا خراب ہو جانا اور عام لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار وغیرہ ایسے محرکات تھے جن کی وجہ سے بے شمار لکھنے والے آہستہ آہستہ تحریک سے دور ہوتے چلے گئے۔(۱۳)

ابتدا میں تحریک کی وسیع المشربی اور اس کے صلح کل منشور کی بنا پر اس کے حامیوں، ہمدردوں اور ارکان کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن سیاسی وجوہات اور ادبی نزاعات کی بنا پر تحریک کی نوعیت اختلافی ہوتی چلی گئی۔ اس کے پہلے منشور (۱۴) کی وسعت اور عمومی مثبت خصوصیات کی بنا پر اس پر کئی ایسے لکھنے والوں نے بھی دستخط کر دیے جو اشتراکی نہ تھے، صرف ادب کو حقیقت پسندانہ یا مقصدی یا افادی یا جدید بنانا چاہتے تھے۔ بعد میں اشتراکیت کا سوال بڑی شدومد سے اٹھایا گیا۔ خود تحریک میں بھی اس ضمن میں اختلاف تھا۔ مثلاً سجاد ظہیر (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۳ء) حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں ترقی پسند ادبی تحریک میں محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہیں بلکہ مختلف عقائد کے لوگوں کے لیے جگہ تھی۔ انجمن ان سے وطنی آزادی اور جمہوریت میں یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی، اشتراکیت میں نہیں۔ مولانا اس معاملے میں انتہا پسند تھے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند کے لیے اشتراکی ہونا ضروری تھا۔ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا۔(۱۵)''

لیکن تحریک میں شامل بعض لوگوں کے نظریات میں اتنی لچک نہیں تھی جتنی سجاد ظہیر کے خیالات میں مندرجہ بالا اقتباس سے محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر تحریک جوں جوں آگے بڑھتی گئی اس میں انتہا پسندی اور بائیں بازو کے سیاسی رجحانات بڑھتے گئے۔ اگرچہ خود مارکسی نظریات ادب کو حد سے زیادہ پروپیگنڈا بنانے اور ادب پر زبردستی موضوع کو مسلط کرنے کے خلاف ہیں۔ خاص طور پر اینگلز کے نظریے میں موضوع کو کسی مخصوص عمل یا صورت حال سے خود بخود نمو پذیر ہونا چاہیے۔(۱۶) لیکن ترقی پسند تحریک لینن کے انتہا پسند ادبی نظریات سے روز بروز زیادہ وابستہ ہوتی گئی۔ اس طرح ادب کو سیاسی مقاصد کا حامل اور نعرے بازی کا ذریعہ بنادیا گیا۔ ادب کو لینن کے جانب دارانہ ادب کے خطوط پر چلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کا ادب سطحی، انفرادیت سے تہی، حد سے زیادہ سپاٹ، حقیقت نگاری سے پُر، ڈھلے ڈھلائے موضوعات اور الفاظ و اصطلاحات کی چار دیواری میں قید ہوگیا۔(۱۷) ہر ترقی پسند شاعر سرخ سویرا اور انقلاب کے گیت گانے لگا اور ہر ترقی پسند نقاد ادبی کی بجائے سیاسی ہوگیا (اس میں یقیناً مستثنیات ہیں۔)

ترقی پسند تحریک کا ایک منفی پہلو یہ تھا کہ اس پر فحش نگاری کا الزام تھا جو کسی حد تک صحیح تھا۔ بعض ترقی پسند قلم کاروں نے عریاں نگاری کو وتیرہ بنالیا اور اس کے لیے جواز بھی گھڑے۔ اگرچہ تحریک نے فحش نگاری کے الزام سے بری ہونے کی کوشش کی لیکن جب تحریک نے ۱۹۴۵ء کی کانفرنس (منعقدہ حیدر آباد دکن) میں فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی تو وہ منظور نہ ہوسکی۔ خاص طور پر مولانا حسرت موہانی نے اس کی مخالفت کی۔(۱۸)

ترقی پسندی کے مفہوم اور تعریف پر بھی اختلاف رہا۔ ترقی پسندی کے مفہوم کو سمجھنے میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ کسی نے صرف اشتراکیت کے پروپیگنڈے کو، کسی نے جدت کو، کسی نے عریاں نویسی کو اور کسی نے مذہب و روایت کے استہزا کو ترقی پسندی جانا۔ حتیٰ کہ ترقی پسندوں کو وضاحت کرنی پڑی کہ ہر قسم کی جدید تحریریں ترقی پسند ادب میں شامل نہیں۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں فرق ہے۔(۱۹)

دراصل غلط فہمیوں کے پھیلانے میں خود ترقی پسندوں کے اس رجحان کا بھی بڑا ہاتھ تھا

جس کے تحت انھوں نے ترقی پسندی میں ہر اچھائی اور مثبت قدر کو شامل کرلیا تھا۔ مساوات، جمہوریت، آزادی، ترقی، انسانیت، عوام دوستی، حقیقت پسندی اور روشن خیالی جیسی صفات کو ترقی پسندی میں شامل کر کے اسے اتنا وسیع المشرب بنا دیا گیا تھا کہ کسی بھی تحریر کو ترقی پسند ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس ''صلح کل'' رویے نے ایک منفی رجحان یہ پیدا کر دیا کہ اگر کسی تحریر میں ترقی پسندی کے خلاف کوئی بات ہوتی تو اس کے لکھنے والے کو ان تمام صفات کا مخالف قرار دیا جاتا مثلاً احتشام حسین لکھتے ہیں: ''جب ایک شخص اس شدت کے ساتھ ترقی پسندی کی مخالفت کرے گا تو پڑھنے والا اس کے متعلق یہی نتیجہ نکالے گا کہ وہ ترقی پسندی کے عام بنیادی عقائد یعنی آزادی، مساوات، جمہوریت، حقیقت پسندی اور عوام دوستی کا مخالف ہے۔(۲۰)''

گویا ترقی پسندی کے خلاف نظریات رکھنے والا ہر طرح سے معتوب و مردود ٹھیرا حالاں کہ ضروری نہیں کہ ترقی پسندی کے خلاف لکھنے یا سوچ رکھنے والا ہر شخص جمہوریت اور مذکورہ بالا دیگر صفات / نظریات کا مخالف ہی ہو۔ کیوں کہ ترقی پسندی کی بنیاد اشتراکیت پر تھی اور اشتراکیت کا مخالف جمہوریت یا آزادی یا مساوات کا حامی ہوسکتا ہے۔

دراصل ترقی پسند تحریک اپنے سوا ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، رعونت، تنگ نظری اور قطعیت تھی اور وہ زندگی کو مارکسی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ مارکس ان کے لیے حرف آخر تھا۔ اس طرح یہ انسان کو ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے کے درپے تھے۔(۲۱) البتہ اس تحریک کی بعض خوبیوں مثلاً خلوص و لگن، عوام دوستی، حقیقت نگاری وغیرہ کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ اس نے زندگی کی ان بصیرتوں کا ادراک کرایا جو سماجی حقائق اور عمرانی تقاضوں کے مطابق تھیں۔(۲۲) اس نے مادّے کے ساتھ عقل اور سائنس کو بھی اہمیت دی اور ادب کی مقصدی بنیادوں کو مستحکم کر کے اسے زندگی کا ترجمان بنا دیا۔(۲۳) اس تحریک نے اردو ادب کے قریب قریب ہر صنف کو ایک زبردست انقلاب سے دوچار کر دیا اور اردو ادب میں نہایت وقیع، متنوع، دلچسپ اور دوامی اہمیت کے حامل اضافے کیے۔

اگرچہ یہ تحریک انتشار کا شکار ہو کر عملاً معدوم ہوگئی۔(۲۴) لیکن اس نے ایک تاریخی

کردار انجام دیا۔ اس کے زیر اثر اردو ادب میں کئی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں سے کئی مثبت تھیں اور اس کے زیر اثر ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ وجود میں آیا۔

اردو ادب میں ترقی پسند نظریات کا پس منظر

ترقی پسند ادبی تحریک نے مختلف اصناف میں مزاح میں جو اضافے کیے ان کا جائزہ لینے سے قبل ہم اس تحریک کے ادب کے محرکات پر ایک نظر ڈالیں گے تا کہ اس تحریک کے مزاح کے محرکات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا سب سے بڑا محرک اشتراکیت تھی۔ تحریک کے بانی (مثلاً سجاد ظہیر وغیرہ) بائیں بازو کے سیاسی خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ترقی پسند نقادوں نے بھی اس حقیقت کو کبھی نہیں چھپایا کہ ان کے ادبی نظریات کی بنیادی مارکس کی جدلیاتی مادّیت پر ہے مثال کے طور پر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ”جہاں تک ترقی پسند ادب کی اصولی اور اساسی حیثیت کا تعلق ہے اس کی بنیاد اسی فلسفیانہ مادّی جدلیت اور تاریخی مادّیت پر ہے جس پر ہمہ گیر اور عملی حیثیت سے انیسویں صدی کے وسط میں نظر ڈالی گئی۔ جسے بعد میں آزمائش کی کسوٹی پر کسا گیا اور ہر شعبہ حیات میں کارآمد پایا گیا۔(۲۵)“

یہ درست ہے کہ تحریک کو ابتداً بڑی وسیع المشرب، صلح کل اور معقول و بے ضرر نظریات و مقاصد رکھنے والی تحریک بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے اشتراکی خیالات رکھنے والے بانیوں نے اراکین کے لیے اشتراکی ہونا ضروری نہیں سمجھا لیکن ان کی صفوں میں انتہا پسند بھی موجود تھے جو اس کے برعکس خیالات رکھتے تھے۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا تحریک کے ادبی نظریات و مقاصد اینگلز کی بجائے لینن کے ادبی نظریات سے قریب تر ہو گئے۔ لینن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اسے ادبی فیصلے صادر کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی سوچ ادبی نہیں سیاسی ہے۔(۲۶)

طبقاتی کشمکش، معاشی جدوجہد اور پیداوار و تقسیم کے جھگڑے اور دولت کی غیر منصفانہ

تقسیم ترقی پسند ادب کا بنیادی موضوع ہے۔ معاشی عدم مساوات کا شکار عوام اور کچلے ہوئے طبقات کے جذبات اور مسائل کی عکاسی کو تحریک کے ادب نے ہمیشہ مقدم جانا ہے۔ اسی طرح غریبوں کے تمام مسائل کی جڑ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کو ٹھیرانے میں بھی اس کا ادب پیش پیش رہا ہے۔(۲۷) ترقی پسند تحریک کے عقائد نے سائنسی عقلیت اور تاریخی و معاشی حقائق کی اہمیت اور طبقاتی کشمکش سے پاک آزاد معاشرے کی تشکیل پر زور دیا۔ تحریک نے ملکی آزادی کی حمایت اور استحصال کی مخالفت کی۔(۲۸) تحریک کا سب سے بڑا نشانہ روایات تھیں۔ تہذیبی ورثے کو بورژوائی، جاگیردارانہ اور طبقاتی کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔(۲۹)

اشتراکیت کے علاوہ تحریک کے ادب کے فروغ اور مقبولیت میں دیگر عوامل بھی کارفرما تھے۔ اردو شاعری سماجی اور سیاسی مسائل کی عکاسی اور حقیقت نگاری کی منزل کو پہلے ہی پا چکی تھی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے میں حالی، شبلی، اکبر، ظفر علی خاں اور اقبال وغیرہ کا نمایاں حصہ ہے۔ اردو شاعری کی طرح اردو نثر بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی سیاسی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ اسالیب کو نبھانے اور مسائل کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکی تھی۔ اردو صحافت نے اتنا انقلاب آفریں رویہ اپنایا تھا کہ اس کے اٹھائے ہوئے بعض نکات و مسائل سیاسی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے تھے۔ اس طرح فکری و فنی افادیت، مقصدیت، سماجی عکاسی اور حقیقت نگاری کا شعور اس دور کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کے طفیل اور مغرب کے زیر اثر پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس قسم کا ادب کسی مخصوص دبستان یا تحریک یا تنظیم کے زیر اثر وجود میں نہیں آیا تھا لیکن بہرحال اس دور کی بعض قدآور ادبی شخصیات مخصوص ادبی رجحانات کی حامل ہونے کی وجہ سے دبستانوں کی حیثیت ضرور حاصل کر گئی تھیں اور ان میں سے بعض مخصوص سیاسی افکار اور سماجی فلسفے کی بھی حامل تھیں۔ ان میں ابوالکلام، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، پریم چند اور اقبال وغیرہ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

مغربی افکار و تعلیم کے زیر اثر ملک کا پڑھا لکھا طبقہ اور دانشور طبقہ جمہوریت، آزادی، طبقاتی کشمکش، مارکسزم اور عقلیت پسندی وغیرہ کی بحثوں سے واقف تھا اور اس سلسلے میں کافی بیداری پھیل چکی تھی۔ خاص طور پر انگریزی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی تڑپ روز بروز

تقسیم ترقی پسند ادب کا بنیادی موضوع ہے۔ معاشی عدم مساوات کا شکار عوام اور کچلے ہوئے طبقات کے جذبات اور مسائل کی عکاسی کو تحریک کے ادب نے ہمیشہ مقدم جانا ہے۔ اسی طرح غریبوں کے تمام مسائل کی جڑ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کو ٹھیرانے میں بھی اس کا ادب پیش پیش رہا ہے۔(۲۷) ترقی پسند تحریک کے عقائد نے سائنسی عقلیت اور تاریخی و معاشی حقائق کی اہمیت اور طبقاتی کشمکش سے پاک آزاد معاشرے کی تشکیل پر زور دیا۔ تحریک نے ملکی آزادی کی حمایت اور استحصال کی مخالفت کی۔(۲۸) تحریک کا سب سے بڑا نشانہ روایات تھیں۔ تہذیبی ورثے کو بورژوائی، جاگیردارانہ اور طبقاتی کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔(۲۹)

اشتراکیت کے علاوہ تحریک کے ادب کے فروغ اور مقبولیت میں دیگر عوامل بھی کارفرما تھے۔ اردو شاعری سماجی اور سیاسی مسائل کی عکاسی اور حقیقت نگاری کی منزل کو پہلے ہی پا چکی تھی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے میں حالی، شبلی، اکبر، ظفر علی خاں اور اقبال وغیرہ کا نمایاں حصہ ہے۔ اردو شاعری کی طرح اردو نثر بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی سیاسی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ اسالیب کو نبھانے اور مسائل کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکی تھی۔ اردو صحافت نے اتنا انقلاب آفریں رویہ اپنایا تھا کہ اس کے اٹھائے ہوئے بعض نکات و مسائل سیاسی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے تھے۔ اس طرح فکری و فنی افادیت، مقصدیت، سماجی عکاسی اور حقیقت نگاری کا شعور اس دور کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کے طفیل اور مغرب کے زیر اثر پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس قسم کا ادب کسی مخصوص دبستان یا تحریک یا تنظیم کے زیر اثر وجود میں نہیں آیا تھا لیکن بہر حال اس دور کی بعض قد آور ادبی شخصیات مخصوص ادبی رجحانات کی حامل ہونے کی وجہ سے دبستانوں کی حیثیت ضرور حاصل کر گئی تھیں اور ان میں سے بعض مخصوص سیاسی افکار اور سماجی فلسفے کی بھی حامل تھیں۔ ان میں ابو الکلام، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، پریم چند اور اقبال وغیرہ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

مغربی افکار و تعلیم کے زیر اثر ملک کا پڑھا لکھا طبقہ اور دانشور طبقہ جمہوریت، آزادی، طبقاتی کشمکش، مارکسزم اور عقلیت پسندی وغیرہ کی بحثوں سے واقف تھا اور اس سلسلے میں کافی بیداری پھیل چکی تھی۔ خاص طور پر انگریزی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی تڑپ روز بروز

بڑھتی جا رہی تھی۔

گویا سیاست، فکر و فلسفہ اور ادب ہر میدان میں ایک نئی سوچ پیدا ہو چکی تھی اور بیسویں صدی کے آغاز ہی سے قدیم رجحانات تبدیل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانے کی نئی کروٹ اور اس میں حقیقت نگاری کا آغاز اس نئے رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ جب ترقی پسندی کی تحریک نے ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا جس میں واقعیت کی عکاسی کرنے، سماجی پستی، معاشی بدحالی اور سیاسی غلامی کے مسائل کو موضوع بنانے کا اعلان تھا اور آزادیٔ رائے، عقلیت اور زندگی کے حقائق کو اہمیت دی گئی تھی تو اسے ہر طرف خوش آمدید کہا گیا۔ تحریک کے ابتدائی صلح کل رویے کی وجہ سے بھی اس کی مقبولیت مندرجہ بالا رجحانات کے ساتھ مل کر قطعی فطری نظر آتی ہے۔

گویا اس تحریک کے لیے ذہنی فضا پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی۔ لیکن اس تحریک کے عروج اور مقبولیت میں وسیع المشربی، مثبت مقاصد اور مارکسی نظریات کے علاوہ نئی نسل کے اس ذہنی انتشار اور گھٹن کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو اس دور کے بحرانی حالات کی دین تھی۔ یہ انتشار ہر اس نسل کے حصے میں آتا ہے جو ایسے ہنگامہ خیز دور میں آنکھ کھولے اور پروان چڑھے۔(۳۰) غالباً اسی گھٹن، انتشار، بیزاری اور مایوسی نے ترقی پسند ادب پر اثرات مرتب کیے اور اس میں تلخی، بیزاری، مایوسی، چڑچڑاپن، استہزا اور طنزیہ انداز سرایت کر گئے۔ نوجوانوں کے ہاتھ میں تحریک کی باگ ڈور ہونے کی وجہ سے اس میں جذباتیت اور جوش زیادہ ہے اور کہیں کہیں تو صرف روایت شکنی اور shock treatment کے نقطۂ نظر سے بھی ادب تخلیق کیا گیا۔ سیاسی نعرے بازی اور پروپیگنڈہ بھی ترقی پسند ادب کے نام پر ہوا۔ اس تحریک میں مثبت اور منفی پہلو دونوں موجود تھے۔

مجموعی طور پر اس نے ادب کو رطب و یابس بہت کچھ دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تحریک کا مزاح کیسا ہے۔